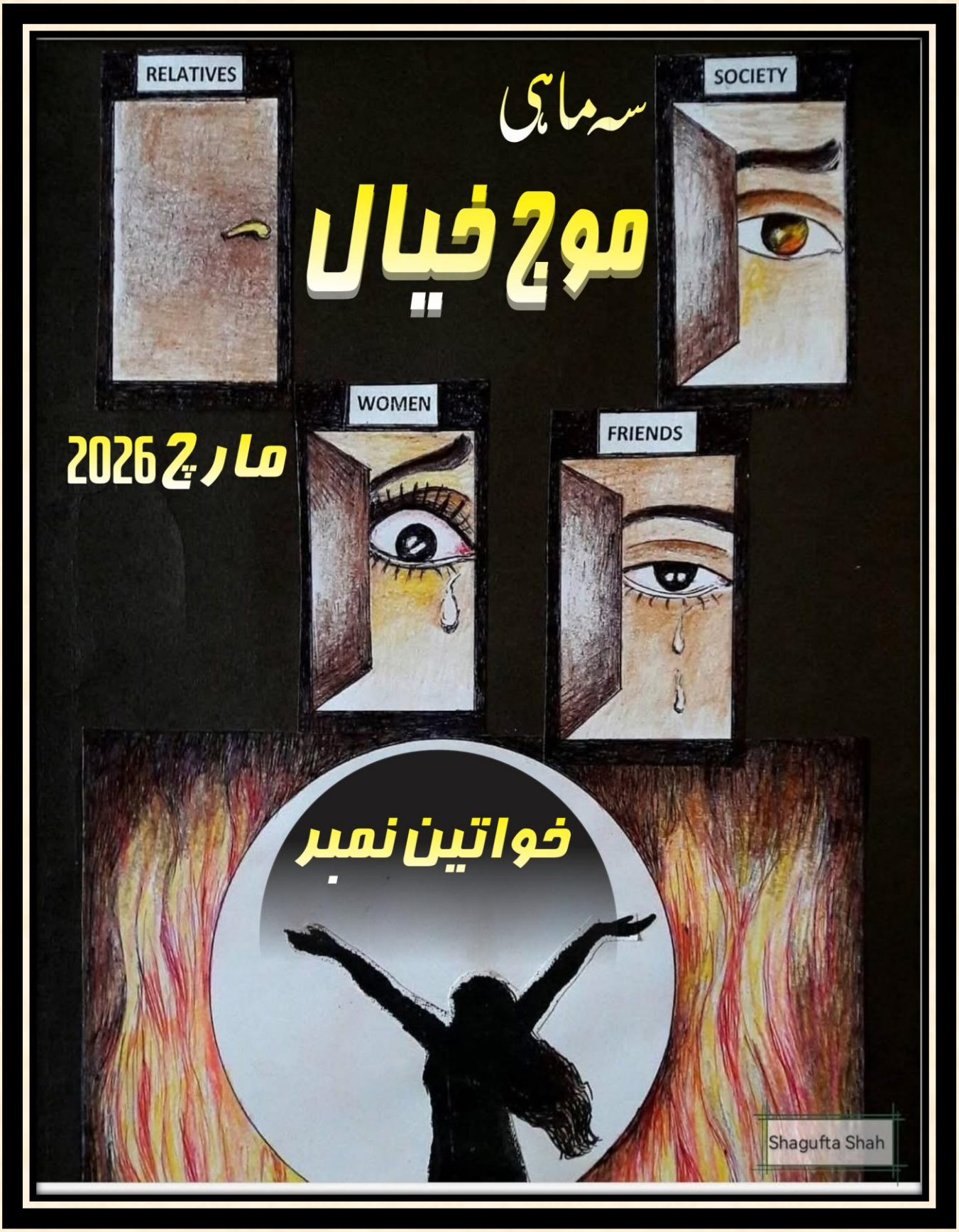
سہ ماہی
موجِ خیال
مارچ 2026
خواتین نمبر
RELATIVES
SOCIETY
WOMEN
FRIENDS
Shagufta Shah

سہ ماہی
موج خیال
زیرِ سرپرستی
شکور پٹھان
مدیرِ اعلیٰ
تبسم حجازی
مدیر
مرزا صہیب اکرام
مجلسِ مشاورت
شگفتہ شاہ کاظمی، پروین شغف، رخسانہ نازنین، خواجہ کوثر حیات
تزئین و ترتیب
محمد معین یوسف
سوشل میڈیا انچارج:
عبیرہ غوری خان

فہرست

اداریہ

باقی سب افسانے ہیں!

- گلاب اور گوبھی — شاہین کمال
- دل آزاری — حمیرا اثاقب
- میں اب مدرسے نہیں جاؤں گا — زیب سندھی / مترجم: آکاش مغل
- سود و زیاں — رخسانہ نازین
- تین کہانیاں — باسط خان
- پینٹنگ فار سیل — نعمان خان نومی
- ڈائیو — ڈاکٹر پروین موسی میمن
- افسانچہ — شگفتہ شاہ کاظمی
- افسانچہ — جاوید نہال حشمی

ان سے ملئے

- بیدر کی ادبی روایت کا درخشاں چراغ – رخسانہ نازنین

کتاب در کتاب

- تبصرہ بر ناول " چراغ ساز " — ڈاکٹر سعدیہ بتول حیدر

شاعری سچ بولتی ہے

- **نعت**
  - تسنیم حسن
- غزلیات
  - شرر دامن
  - مبارک خان

- مسرور ادیب
- محبوب خیر آبادی
- امتیاز قریشی
- گل زرادیبہ
- محمد شکیل اختر در بھنگوی
- ڈاکٹر زینت احسان قریشی
- سُہیل آزاد
- شارق صدیقی
- رفعت جمال

❖ نظمیں

- آگ کا گڑھا - شاہانہ جاوید
- فقط تاریخ بدلی ہے۔ عمران قمر
- کہیں دور وہ روشنی - کرن ہاشمی

چلتے ہو تو راستے بول اٹھتے ہیں

❖ بھوپال کا سفر

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار۔۔۔

❖ اک عجب دنیا ہے یہ واللہ انٹرنیٹ کی — شیز اجلال پوری
❖ ابن صفی کے کردار — عبیرہ خان غوری
❖ بزرگ کے تین دن — آکاش مغل

خواتین کے عالمی دن کے خصوصی مضامین

❖ بولیں اماں محمد علی کی — شکور پٹھان
❖ عالمی یومِ خواتین — حقیقت یا مصنوعی جشن؟ — پروین شغف

- ٹریجیڈی کوئین مینا کماری — رخشندہ بخت
- صنف نازک ہوں مگر روح رستم ہے میری — تبسم حجازی / مرزا صہیب اکرام

اداریہ

موج خیال کا تیسرا شمارہ لے کر حاضر ہیں۔عالمی خواتین دن کی مناسبت سے یہ رسالہ آپ تک مارچ کے پہلے ہفتہ میں پہچانے کی خواہش تھی۔
لیکن ہزاروں خواہشیں ایسی کہ۔۔۔
کچھ رمضان اور عید کی مصروفیات، کچھ عالمی حالات سے طاری پژمردگی اور کچھ انتظامیہ کی کوتاہی کے باعث تاخیر ہوگئی۔۔
لیکن امید ہے کہ رسالہ دیکھ کر آپ اس بات سے صرف نظر کریں گے۔۔
حسب روایت کچھ جانے پہچانے لکھنے والوں کے ساتھ کچھ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات سے آراستہ یہ رسالہ آپ کے حوالے۔
اپنی قیمتی آرا سے ضرور آگاہ کریں۔

تبسم حجازی

باقی
سب
افسانے
ہیں

امی، مرد آخر اتنا ٹھرکی کیوں ہوتا ہے؟

وہ ایک ہی کا ہو کر کیوں نہیں رہ سکتا؟

نفیس نے فون کی اسکرین سے نظریں ہٹاتے ہوئے مجھ سے پوچھا؟

ہیں!! صبح صبح ایسا لایخل مسئلہ؟

اللہ امی! سوالات کا کوئی ٹائم ٹیبل تھوڑی نا ہوتا ہے. نفیس نے ہنستے ہوئے میرے گالوں کو بوسہ دیا اور گاڑی کی چابی سنبھالتی یہ جا وہ جا .

نفیس میری دلاری بیٹی تو یہ سوال اچھال کر دفتر سدھاری اور میں آملیٹ پلٹتے اور پراٹھے بیلتے پراٹھوں کے بل میں الجھتی ہی چلی گئی. دوران ناشتا یہ سوال مجھے بہت بہت پیچھے لے گیا. وہ بھٹو کا دورِ زوال تھا کہ اُس سامری کی ساحری کی معیاد پوری ہو چکی تھی. سرمہ سرکار شب خون مار چکے تھے اور ان کی غنّی مسکراہٹ نے سب کچھ بدل دیا تھا. ہوا، فضا، ماحول اور سماجی برتاؤ سب شدید گھٹن زدہ. میں جامعہ کراچی میں انرز سے فائنل میں آچکی تھی. ان دنوں جامعہ میں لگایا جانے والا نعرہ " ایشیا سبز " ہے جانے کس احمق کا تخلیق کردہ تھا. کاہے کا سبز بھائی! ایشیا تو ہمیشہ ہی خونم خون رہا ہے، لہو سے تر بتر سرخم سرخ اور اب تو ہمارے پڑوس میں بھی جنگ بھڑک چکی تھی. خیر دنیا ازل سے بے سکون ہی رہی ہے۔ جامعہ میں ہمارا فائنل ائیر کا فائنل سیمسٹر تھا تو ہم سب کا پگلانا تو بنتا ہی تھا. شعبہ بین الاقوامی تعلقات میں ہم ساتوں کا شمار شعبے کی کریم میں ہوتا تھا. ہمارے گروپ میں تین بدیسی اور باقی کے چار اپنی کراچی کے بھئیے. افغانستان کا جمال شاہ اور ایران سے آئے باسم رضا اور سیمی شیرازی. ان دنوں پاکستان شاید ایرانیوں کا دوسرا گھر تھا. ہر شعبے میں ایرانیوں کی کثرت تھی. ہمارے ڈپارٹمنٹ کی ملکہ حسن مہر یار خان، پی ای سی ایچ ایس سے، ہمایوں شہزاد، ناگن چورنگی، نشاط ظفر ہمارے گروپ کی سقراط نارتھ ناظم آباد اور میں عزیز آباد کے پوائنٹ سے جامعہ پہنچتے تھے. مہر اور سیمی کی چوٹ برابر کی تھی کہ مہر حسنِ صورت سے آراستہ تو سیمی، سیمی تن و قاتل ادا. شیخ سعدی کی ہم وطن سیمی شیرازی الٹرا موڈ تھی. اکثر ڈپارٹمنٹ میں لانگ اسکرٹ یا چست جینز میں آتی. مرغوب تو اسے شارٹ

اسکرٹ تھے پر صد شکر کہ اس نے شعبے کے لڑکوں پر رحم کھاتے ہوئے کبھی انہیں اُس کڑے امتحان سے نہیں گزارا. جب ہم سب فرسٹ ائیر آنرز میں تھے تو انہی دنوں ایک لیکچرار جرمنی سے تازہ تازہ پی ایچ ڈی کر کے آئیں تھیں. ان کے ماڈرن لباس نے جامعہ میں تھرتھریاں مچادی تھیں اور ان کا لباس گویا قربِ قیامت کی نشانی ٹھہرا. یوں جامعہ میں ڈریس کوڈ لاگو کر دیا گیا .

سجیلا ہینڈسم باسم رضا پہلے تو لو پھر بولو کی تفسیر، حقیقتاً اس کی خاموشی بھی گونج دار ہوتی. ہماری فضول کی بحثوں میں باسم کا فرمان ہی فرمانِ آخر ہوتا. جلال آباد سے آیا جمال شاہ اپنے پی ٹی وی کی حسین اداکارہ، فریال گوہر کے شوہر نامدار ہی طرح خوش جمال مگر تند و گرم مزاج. مہر یار خان بلا کی صاف گو بلکہ منہ پھٹ مگر وہی بات کہ حسن کے اضافی نمبروں کے صدقے

کتنے شریں ہیں تیرے لب کہ رقیب

گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

ہمایوں شہزاد مرنجان مرنج اور لطیفے گھڑنے میں ماہر. رہی میں یعنی تمکین تو میں نمک کی کان تو ہر گز نہ تھی پر شکلاً و مزاجاً قدرے نمکین و تیکھی. میری زندگی کا بہترین دور زمانہ طالب علمی ہی تھا. گو کہ ہم سب پر پڑھائی کا بار گراں اور ہم سب اپنی اپنی پوزیشن مستحکم رکھنے کی کوششوں میں اپنی جان کھپاتے ہوئے اپنے آپ کو دنیا کی مظلوم ترین مخلوق گردانا کرتے تھے. تب کسے خبر تھی کہ زندگی کیسے کیسے جھکولے دے گی.

کووڈ سے ذرا ہی پہلے کی بات ہے کہ جامعہ کے شعبہ بین الاقوامی میں ری یونین کا غلغلہ اٹھا. مہر کی زندگی چونکہ جھیل کا کنول سو اس نے ہمایوں، نشاط، باسم، سیمی اور جمال شاہ کی کھوج میں جہاں کنویں میں بانس ڈلوائے وہیں فرہنگ ایران کے اسٹاف کا ناک میں دم کر دیا. میں اور مہر ابھی تک رابطے میں تھے گو بارہا یہ سلسلہ مصروفیات و مشکلات کے سبب ٹوٹتا رہا. میری مہر سے آخری ملاقات، کوئی چار سال قبل اس کی چھوٹی بیٹی کی شادی پر ہوئی تھی .

جب مجھے واٹس ایپ پر ری یونین کا دعوت نامہ ملا تو میں دیر تک فون کی اسکرین کو گھورتی رہی. زندگی نے اتنے دھچکے و پٹخنے دیئے تھے کہ ماضی دھول ہوا. ناگوار واقعات کو بھلانے کے چکر میں ذہن بہت کچھ خوشگوار کو بھی ڈیلیٹ کرتا چلا گیا تھا. میرا ارتکاز میری منجھلی بیٹی کی بلند پکار پر ٹوٹا.

امی.... امی... کیا ہوا امی؟

سب خیریت ہے ناں!!

ہاں.. ہاں... سب خیریت ہے. یہ میرے ڈپارٹمنٹ کا ری یونین کا کارڈ آیا ہے" . پینتیس سالہ ری یونین "اب بھلا کون آئے گا؟

اتنے لمبے عرصے میں سب جانے کدھر کدھر بکھر چکے ہونگے.

ارے تو کیا ہوا امی! جو بھی آئیں گے ان سے ملاقات کر لیجیے گا پھر مہر آنٹی تو آپ کے ساتھ ہی ہونگی نا.

منجھلی بیٹی نے تینوں بہنوں کو بھی دعوت کی بابت ٹھسک دیا. غرض چاروں بیٹیوں نے میرا گھراؤ کر کے مجھے تقریب میں جانے پر راضی کر ہی لیا. یہ مہر کی ہی کوششوں کا ثمر تھا کہ ہم ساتوں، پینتیس سال بعد ملنے والے تھے .

جولائی کی بادلوں سے ڈھکی سہ پہر اور مادر علمی.

کیا کیا ہمیں یاد آیا جب یاد تیری آئی

وہ بے فکری کے دن، بے انت باتیں اور لایعنی نکات و مسائل پر طویل بحثیں. ری یونین کی تقریب کا انتظام اسٹاف روم میں کیا گیا تھا. مدتوں بعد ہم سب اکٹھے ہوئے. جہلم میں بیاہی نشاط اپنی سرجری کے سبب شریک نہ ہو سکی پر بھلا ہو ٹیکنالوجی کا، فیس ٹائم نے اس کا دیدار کرا ہی دیا. مہر ہماری سدا کی منتظم و دیدہ ور. اس نے سب کے سینے پر نیم ٹیگ سجا دیا ورنہ بخدا کوئی بھی پہچان میں نہ آتا تھا. نازک اندام سیمی شیر ازی کی ناز کی فربہی میں ڈھل چکی تھی اور بگ ٹٹ بھاگتے وقت نے اس کی خوب صورت بلونڈ زلفوں کو کپاس کیا. پر بھئی سیمی آج بھی اسٹائلش تھی .

خدایا خدایا!!! باسم تمہیں کیا ہوا؟

نحیف اور گنجے باسم رضا کو دیکھ کر میں بالکل چکرا گئی! وقت نے اس بے دردی سے ہم میں سے کسی کو بھی نہیں روندا تھا .

کچھ نہیں میں نے سرطان کو زیر کیا ہے. تم جانو کینسر جاتے جاتے پھونک ہی چھوڑ جاتا ہے.

خیر مجھے چھوڑو اپنی سناؤ تمکین!

باسم نے اشتیاق سے پوچھا .

تم بیماری اور میں سخت حالات کے پاٹوں میں آئے اور زندگی نے مجھے بھی رولر کوسٹر پر بیٹھا دیا .

میں رنجیدہ سی ہنسی ہنس دی.

یہ جمال شاہ کہاں رہ گیا؟

Think of the devil and the devil is here.

ایک دم سے جمال شاہ نے میرے سامنے جھکتے ہوئے کہا.

کہاں ہوتے ہو؟

مجھے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جمال میں زیادہ بدلاؤ نہیں آیا تھا.

اب میں تمہارا محبوب کراچی چھوڑ کر عرصے سے پنڈی بوائے ہو گیا ہوں. اس نے ایڑی بجاتے ہوئے کہا اور ہم سب بے ساختہ پچھلے زمانے کی طرح ہنس پڑے. میں نے چپکے چپکے سب کا گہرا جائزہ لیا. ہم سب میں آسودہ ہمایوں شہزاد لگ رہا تھا گو کہ نہ اس کی گنج میں کمی تھی اور نہ ہی مٹاپے میں کوئی کسر مگر اس کی آنکھوں میں ابھی بھی جوت زندہ تھی.

ہماری ملکہ حسن مہر یار خان ابھی بھی شاداب مگر کاسمیٹکس کی بدولت. گزرتے ستم گر وقت نے ہم سب سے خراج لیا تھا. چائے بہت پر تکلف تھی پر جو سچ کہوں تو ایک دوسرے کو سننے کی اتنی چاہ اور للک تھی کہ باقی سب کچھ بے معنی ہو گیا تھا. باتوں باتوں میں جمال شاہ نے بتایا کہ دو سال قبل اس کی طلاق ہو گئی ہے. مہر نے تڑ سے کہا کہ " وجہ یقیناً تمہاری نظر بازیاں رہی ہو نگی " !

مجھے مہر کے جملے سے زیادہ اس کے لہجے نے الجھایا .

What do you mean by نظر بازی

بھئی اللہ کی خوب صورت تخلیق کو سراہنا اور سبحان اللہ کہنا کب سے گناہ ہو گیا؟

جمال شاہ نے سگار کے چھلے ہونٹوں سے نکالتے ہوئے جتوں چڑھا کر پوچھا.

جمال پلیز تم سگار گل کر دو مجھے دمہ ہے. اچھا ایمانداری سے یہ بتاؤ کہ کیا تعریف و توصیف کی یہی آزادی تم زرتاشا کو بھی دیتے؟

او کم آن سیمی! شادی شدہ عورتیں کب اس علت میں پڑتی ہیں. ان کے دل اور آنکھوں میں تو اپنے میاں ہی کی تصویر ہوتی ہے. جمال نے تنک کر کہا .

یہ تو ان شرافت اور نیک نیتی ہوئی ناں جمال. ویسے تمہیں ایک بات بتاؤں عورت کمال اداکار. وہ ساری عمر تمہارے ساتھ بتانے پر بھی تمہیں اپنے من کا بھید نہیں دیتی .

میں بھی اس بحث میں شامل ہو چکی تھی .

مردوں کے متعلق تو میں جانتا ہوں کہ ان کے دل میں ایک دنیا بسی ہوتی ہے مگر عورتیں یقیناً ایک وقت میں ایک ہی تصویر دل میں لگاتی ہیں. بہر حال میں شاید اس مد میں رائے دینے کے لیے کوالیفائی نہیں کرتا. آپ خواتین ہی بہتر بتا سکتی ہیں .

کم گو باسم شیرازی نے آہستگی سے کہا .

تم بالکل رائے دینے کے لیے کوالیفائی کرتے ہو بلکہ دنیا کا ہر انسان رائے کا حق رکھتا ہے. محبت میں صنفی تفریق نہیں ہوتی باسم. تمکین نے بالکل صحیح کہا، عورتیں اداکار تو اچھی ہوتی ہی ہیں ساتھ اپنے نفس پہ ان کی گرفت بھی مضبوط. پھر ہمارے یہاں جس طرح بند شوں میں جکڑ کر بیٹیوں کی تربیت کی جاتی ہے اس میں وہ بہت کم ہی اپنی رائے یا پسند کے اظہار پر قادر. ہاں یہ بھی حقیقت کہ عورتوں میں مردوں کے مقابلے ٹھرک بازی بہت کم. عورتیں شادی کو مذہبی فریضہ مانتے ہوئے دوسرے مردوں کو بالکل نہیں سوچتیں جبکہ مرد کم ہی ان تکلفات میں پڑتے ہیں .

مہر کے بجھے انداز پر میرے دل نے ایک بیٹ مس کی .

مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مہر تمہاری تو لو میرج ہوئی تھی ناں؟

جمال شاہ بے اختیار مہر سے پوچھ بیٹھا .

لو ہو یا ارینج تمام شادیاں کچھ عرصے بعد محض شادیاں اور ذمہ داریوں کا بیگج ہی رہ جاتی ہیں .

سیمی نے بروقت مداخلت کی .

یہ ٹھرکی کیسا عجیب لفظ ہے دوستو!! میں نے کراچی ہوتے ہوئے تو کبھی نہیں سنا تھا؟

باسم کی حیرانی دیدنی تھی .

باسم شیرازی ہمارے دور کا لچا، لفنگا، آوارہ آج کا ٹھرکی ہے. یہ لفظ آج کل بہت اِن اور یہ جذبہ بھی جگہ جگہ گٹر کی طرح ابل رہا ہے .

مہر کا پتھریلا انداز بہت کچھ ان کہا بیان کر رہا تھا .

اچھا سچی سچی بتاؤ کیا تم شادی شدہ عورتیں مردوں کو نہیں دیکھتی، سوچتیں؟

نہیں جمال میرے خیال میں شادی شدہ عورتوں میں ایسی گھٹیا سوچ کا تناسب بہت ہی کم ہے. ایسا نہیں کہ عورتیں حسِ جمال نہیں رکھتی یا احساس کے گداز سے محروم ہیں مگر ایک تو ان کی تربیت اور پھر ان کا مضبوط نفس انہیں کم ہی لڑکھڑانے دیتا ہے. میں نے قطعیت سے جواب دیا .

مجھے نہیں لگتا کہ مردوں میں ایسی کوئی کشش ہوتی ہے کہ عورتیں ان پر فوراً مر مٹیں چاہے وہ یوسف ثانی ہی کیوں نہ ہوں. میں نے دیکھا ہے عورتیں بہت ہی committed ہوتی ہیں البتہ مردوں کے لیے ہر عورت میں کوئی نہ کوئی کشش ضرور ہوتی ہے۔

ہمایوں نے اپنا تجزیہ پیش کیا .

تمہاری بات درست ہے ہمایوں عورتیں فوراً کم ہی مرتی ہیں. ٹین ایج میں شاید لو ایٹ فرسٹ سائٹ کا رولا ہوتا ہو تو ہو ورنہ عورتیں یوسف پر کم ہی فدا ہوتی ہیں البتہ یعقوب کی طلبگار ضرور. میں نے جمال کے گہرے اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے ہمایوں کو جواب دیا .

ہیں!! یعقوب؟ اب یہ مردوں کی کون سی قسم ہے بھئی؟

جمال نے جھلاتے ہوئے پوچھا؟

میرا مطلب ہے کہ عورتیں مردوں کی ظاہری خوبصورتی پر کم ہی توجہ دیتی ہیں البتہ سیرت کی قدردان ضرور. انہیں کیئر نگ اور قدر شناس مرد زیادہ پسند کہ عورتوں کے لیے تحفظ مقدم.

بھئی کیئر تو سب کی ضرورتِ اولی. یہ تو سامنے ہی کی بات ہے تمکین؟

ہمایوں نے ہنستے ہوئے کہا .

اللہ کی بندیوں، دنیا بنی آدم و حوا کی کہانی پر ہے۔ اگر جہان بھر کے مرد سدھر جائیں تو دنیا کی ساری رنگینی ہی ختم ہو جائے۔ ذرا سوچو اگر عورتوں کو سراہا نہیں جائے گا تو صنفِ لطیف کا تو بھٹہ ہی بیٹھ جائے گا. معزز خواتین! اگر مرد حضرات شریف ہو گئے تو دنیا بے رنگ ہو جائے گی. نہ کوئی شاعر ہو گا نہ گائیک اور نہ ہی مصور و سنگتراش اور اربوں ڈالرز کی کوسمیٹک انڈسٹری کا بھی دیوالیہ نکل جائے گا .

جمال کے جوشِ خطابت پر ہم سب بے طرح ہنس پڑے .

ارے کیوں کیا بیویاں ناکافی ہوتی ہیں شاعری اور مصوری کے لیے؟

مہر کا سوال برجستہ .

کسی نے آج تک بیوی پر شاعری کی ہے؟

جمال نے ترنت سوال پلٹایا .

یہ کیا بات ہوئی؟ یہ تو زیادتی ہے بھئی. بیوی پر شاعری، مصوری سب ہونی چاہیے.

میں تو گویا تلملا ہی گئی .

جاں نثار اختر، کیفی اعظمی اور گلزار نے تو کی ہے،

ہمایوں نے گراں قدر معلومات فراہم کی.

مرد چاہے گلاب پیش کرتے ہوئے چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو ہی کیوں نہ گائے، آگے سے بیگم صاحبہ فرمائیں گی،

سنیے! گوبھی اور دھنیا لانا نہ بھولیے گا۔

جمال نے نئی پھلجھڑی چھوڑی.

لو تو اس میں کیا برائی ہے؟

سچی بات تو یہی کہ گلاب کے مقابلے میں گوبھی کا پھول economical ہونے کے ساتھ ساتھ پریکٹیکل بھی .

سیمی کی لوجک نے جمال کو کلین بولڈ کر دیا .

ہاں چاہے سارے رومانس کی ایسی کی تیسی ہی کیوں نہ ہو جائے؟

جمال اب بھی اپنے بات پر اڑا ہوا تھا۔

مسئلہ فقط اتنا ہے جمال کہ مردوں کے لیے رومانس پارٹ ٹائم جبکہ عورتوں کے لیے فل ٹائم ہوتا ہے. اب دیکھو نا وہ نیک پروین اسی دھنیا پتی کو باریک باریک کتر کر پھینٹے ہوئے بیسن میں شامل کر زبردست پکوڑے، گرما گرم چائے کے ساتھ پیش کرے گی .

میری اس بات پر جہاں قہقہہ پھوٹا وہیں جمال نے مسکین سی آواز میں کہا، جی اوریوں سارے رومانس کا دھڑن تختہ کر دے گی.

وہ یقیناً ایک خوشگوار شام تھی. ہم سب چائے کی دوسری کپ سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ گرج برس مینہ برسنے لگا. میں مہر کے ساتھ بارش کے نظارے کے لیے کوریڈور میں آ گئی. مہر کے چہرے پر بہت تناؤ تھا.

کیا بات ہے مہرو؟

میں تھک گئی ہوں تمکنت! اب اور کتنا اور آخر کب تک ؟؟ کاظم کے آئے دن کے چلنے والے معاشقے اب بیٹی کا گھر خراب کرنے کے درپے ہیں. اسے تو جیسے کسی بات سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا، کچھ نظر ہی نہیں آتا ہے. بزنس پہلے ہی ٹھپ ہے، اب تو میرے پاس کوئی پراپرٹی بھی نہیں بچی اور مفلس بڑھاپا دانت نکوسے سامنے کھڑا ہے .

میں صدمے سے گنگ رہ گئی، مجھے اپنی گزری مشکلات مہر کی جاری اذیت کے آگے بہت چھوٹی لگیں.

میں نے اسے خاموشی سے گلے لگالیا کہ اس کے دکھ کا مداوا میرے بس میں نہ تھا .

چلتے سمے ہم سب نے ایک دوسرے کا نمبر لیا اور ہمایوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے واٹس ایپ پر گروپ بنا کر سب کو ایڈ کر دیا. اس نے گروپ کا نام " دب اکبر " رکھا .

واٹس ایپ گروپ کے طفیل ہم سب ایک بار پھر جڑ گئے تھے. آج سوچتی ہوں نہ ہی جڑے ہوتے تو اچھا تھا کہ لاعلمی بھی نعمت. تین سال قبل ایران میں کرد نوجوان " مہسا امینی " کو اسکارف سے چند بال نظر آنے پر گرفتار کیا گیا تھا. زبردست تشدد کا شکار وہ ہنستی کھیلتی لڑکی جان کی بازی ہار گئی. احتجاجاً ایران میں ملک گیر مظاہرے شروع ہو گئے اور ہماری فیمنسٹ سیمی شیرازی بھی احتجاج کا حصہ بنی. اس نے دھرنے دیئے جلوس نکالا اور بالآخر گرفتار ہوئی. قید میں تشدد و ذلت نے اس کا دماغی توازن الٹ دیا. اب ہماری پیاری، گولڈ میڈلسٹ ذہین و فطین دوست، شیراز کے دماغی ہسپتال میں مستقل زیر علاج .

زندگی کتنی بے مہر ہے. ہم سب تدبیر کی تگ و دو کرتے ہوئے بھی تقدیر کی شمشیر سے گھائل ہو جاتے ہیں .

شہر کی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے کانفرنس ہال میں " ویمینس ڈے " کی شاندار تقریب منائی جارہی تھی۔ شہر کی نامور اور سرکردہ شخصیات کی موجودگی نے تقریب کی اہمیت اور رونق میں اضافہ کر دیا تھا۔ مختلف کلچرل پروگرام ہوئے۔ خواتین کی فلاح و بہبود اور تحفظ کے متعلق غور و خوص کیا گیا، تجاویز پیش کی گئیں۔ مختلف شعبے جات میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والی خواتین کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ اور انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ انہی خواتین میں عروسہ خان بھی تھیں۔ جنہیں کامیاب بزنس ویمین اور میڈیا پرسنالٹی کے خطاب و اعزاز سے نوازا گیا۔ جو ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کی مالک، نیوز ریڈر اور ہوسٹ تھیں۔ ایک خاتون ہونے کے باوجود انہوں نے اس شعبے میں بلند اور مستحکم مقام بنایا اور خواتین کو نئی پہچان، نئی سمت، نیا پیغام دینے میں کامیاب رہیں۔ کیمروں کے فلش کی چکاچوند اور تالیوں کی گونج میں چیف منسٹر صاحب نے انہیں ایوارڈ سے نوازا۔ اور خواتین کے لئے آئیڈیل قرار دیا۔

خوبصورتی، خوش مزاجی، خوش کلامی اور خوش لباسی کا مجموعہ عروسہ خان واقعی ایک قابل فخر اور قابل رشک خاتون تھیں۔ خواب دیکھنے اور انہیں تعبیر دینے کا جنون رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ خود پسندی اور باغیانہ مزاج بچپن سے ہی تھا جو بڑھتی عمر کے ساتھ سرشت کا حصہ بن گیا۔ معاشرتی روایتوں اور بندھنوں سے بیزار، آزاد اور روشن خیال، پر عزم، آہنی ارادوں کی مالک، انتہائی دولت مند اور بارسوخ گھرانے سے تعلق سونے پہ سہاگہ ثابت ہوا۔ غیر معمولی ذہانت پائی تھی جس کا بخوبی استعمال کیا۔ دولت، حسن، قابلیت، ذہانت۔۔۔۔۔۔ ایک عورت کی ترقی کے ضامن ۔!!!

انہوں نے قدرت کی عطا کردہ ان نعمتوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور اپنی شخصیت کو ایسے سانچے میں ڈھالا کہ " آج وہ کامیابی اور روشن خیالی کی علامت بن گئیں۔ دلکش، پرکشش اور پروقار سراپا مکمل نگاہ بن گیا۔ وہ زینہ بہ زینہ کامیابی کی منازل طے کرتی گئیں۔ شہرت قدم چومتی گئی۔ تعریف و توصیف کے گلوں سے وجود مہکتا رہا۔

رات دیر گئے تقریب کے اختتام پر تھکی ہاری گھر لوٹیں۔ جدید طرز تعمیر سے آراستہ، وسیع و عریض بنگلے میں تاریکی کا راج تھا۔ سارے ملازم سو چکے تھے۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ کار پورچ میں رکی۔ باوردی ڈرائیور نے مودب انداز میں کار کا دروازہ کھولا۔ انہوں نے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دی۔ پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ بتیاں جلائیں۔ پل بھر میں سارا بنگلہ روشن ہو گیا۔ ٹرافی اور بوکے میز پہ رکھے اور فریج کھول کر پانی کی بوتل اور گلاس ہاتھ میں لئے صوفے پہ ڈھے سی گئیں۔ چہرے کی چمک یکایک ماند پڑ گئی۔ پلکوں کی دہلیز پہ بے ساختہ ایک آنسو ٹھہر گیا۔ تنہائی کے جان لیوا احساس نے مضطرب کر دیا۔ آج سب کچھ انکی دسترس میں تھا۔! دولت، شہرت، کامیابی، ہزاروں پرستار۔۔۔! لیکن وہ کتنی تہی دست و تہی دامن تھیں! شہرت اور کامیابی اپنا خراج وصول کرتی ہے خراج انہوں نے اس صورت ادا کیا تھا کہ " برسوں قبل اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ " انکی بے پناہ مصروفیات پر انہیں اعتراض ہونے لگا تھا اور کسی کا اعتراض انہیں کبھی گوارہ نہ تھا۔! سو انہوں نے یہ تعلق ہی توڑ دیا۔ !بچوں کا جھمیلا بھی نہ پالا تھا لہذا کوئی جھنجھٹ ہی نہ رہا۔ !وہ اپنی مرضی کے مطابق خود مختار زندگی بسر کرتی رہیں۔

سارا دن سجی سنوری، چہرے پہ نمائشی مسکراہٹ سجائے لوگوں سے رسمی باتیں کرنا، کھوکھلے قہقہے لگانا، لوگوں کو مرعوب کرنا معمول بن گیا۔ بناوٹی چہروں کے درمیان رہ کر وہ بھی ایک بناوٹی زندگی جینے کی عادی ہو گئی تھیں۔ لیکن رات کو تنہائیاں انکے چہرے سے یہ نقاب اتار کر پھینک دیتیں۔ آئینے میں میک اپ سے عاری چہرہ کتنا بے رونق اور پر سوز لگتا۔ جیسے جہاں بھر کی اداسیاں اور مایوسیاں سمٹ کر اسکے نقوش میں سما گئی ہوں۔ اس محل نما گھر کے سونے در و یوار عجیب سی محرومی کا احساس دلاتے۔ بے خواب آنکھیں نیند کو ترس جاتیں۔ کچھ پچھتاوے ناگ کی مانند ڈستے۔ بستر پہ کروٹیں بدلتے ہوئے رات بیت جاتی۔ صبح وہ چہرے پہ میک اپ کی تہیں جما کر دنیا کی بھیڑ میں کھو جاتیں۔ برسوں سے زندگی اسی نہج پہ گزر رہی تھی۔ لیکن آج انہیں اپنی تنگ دامنی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ تقریب سے واپسی پر انکی کار خراب ہو گئی۔ ڈرائیور کار کی مرمت میں مصروف تھا۔ وہ کار میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئیں۔ اچٹتی سی نگاہ سڑک پہ ڈالی۔ سنسان سڑک پہ آس پاس کوئی موجود نہ تھا۔ وہ کار کا ڈور کھول کر باہر نکلیں اور کار سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں کہ ایک تیز رفتار کار قریب سے گزری۔ پھر کچھ دور جا کے پلٹ آئی اور انکے قریب آ کر رک گئی۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں انہوں نے دیکھا۔ کار میں بیٹھی فیملی کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ وہ سبھی کار سے اتر آئے تھے۔ ایک برقعہ پوش خاتون جو انہی کی ہمعمر تھیں، گرمجوشی سے انکی طرف بڑھیں۔

"عروسہ۔ میری جان۔ " ! آواز سنتے ہی انکے چہرے پہ شناسائی کی چمک آ گئی۔

"مدیحہ، اوہ۔ اتنے سالوں بعد؟ کہاں تھیں تم؟ " انکے لہجے میں بھی خوشی در آئی۔ دونوں بے ساختہ گلے ملیں۔

" میں اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عربیہ میں تھی۔ اب بچوں کی پڑھائی کے لئے ہم وطن لوٹ آئے ہیں۔ آصف انجینئر ہیں۔ اب یہیں کنسٹرکشن کے بزنس میں ہیں۔ یہ میری بیٹی ثوبیہ بی ای کی طالبہ ہے، بیٹا عاقب میڈیکل کا اسٹوڈینٹ ہے۔

" مدیحہ خوشی سے سرشار تعارف کروا رہی تھیں۔ عروسہ خان کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ " اور تم۔۔۔؟ "

"میں۔ہاؤز وائف۔ !گھر،شوہر،بچے۔یہی تو زندگی ہے۔ " وہ کھکھلا کر ہنس پڑیں۔جیسے دور دور تک گھنگھرو بج اٹھے ہوں۔کتنی طمانیت،کتنی سرشاری ،کتنی آسودگی اور کتنا فخر تھا مدیحہ کے لہجے میں۔ !!!

"عروسہ۔تم گھر آؤ۔تفصیلی بات کریں گے سکون سے۔ " مدیحہ نے وزیٹنگ کارڈ انکے ہاتھ میں تھمایا۔اور انکی کار زن سے آگے بڑھ گئی۔مدیحہ نے یہ نہیں پوچھا ان سے کہ " تم کیا ہو؟ "

شاید ضرورت نہ سمجھی ہو گی !

"وہ کیا ہیں؟ " دنیا بخوبی جانتی تھی!

کافی دیر سے رکے ہوئے آنسوؤں کے سیلاب نے ضبط کے باندھ توڑ دیئے۔اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔!!!

عابدہ کمرے میں عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی تو امتیاز اندر داخل ہوا---جب عابدہ نے سلام پھیرا تو امتیاز کو وہیں کھڑے پایا---اس نے تسلی سے دعا کی اور جائے نماز سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی----

"نا یہ بتا کہ تو نے ہاتھ کیسے باندھے ہوئے تھے نماز میں ؟"

امتیاز کا لہجہ گرم تھا ----

باجی مریم اسی طرح ہاتھ باندھتی ہیں---اتنے عرصے سے ان کو دیکھ رہی ہوں----میرا دل کہتا ہے کہ وہ صحیح نماز پڑھتی ہیں" ----

عابدہ نے سکون سے وضاحت دی تھی----

رہنے دے تو اپنے دل کو--- تیرے دل کی کیا اوقات ہے---اسی طرح پڑھا کر جیسے وڈے باجی نے نماز سکھائی تھی---

انداز کافی جارحانہ تھا----عابدہ کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ پی گئی ---

سحری میں صرف بیس منٹ رہتے تھے جب عابدہ کی آنکھ کھلی----اس نے مارا مار برآمدے میں آکر چولہا جلایا اور دو تین روٹیاں پکائیں ساتھ ساتھ دونوں لڑکوں کو آوازیں دیتی رہی.

اٹھ جاؤ اذان !! دانش اٹھ جاؤ بیٹا

اندر سے امتیاز غرایا.

شور نہ کر نیند خراب نہ کر

ایڈی توں مولویانی!!!!

روزانہ تو دونوں جلدی اٹھ جاتے تھے مگر آج اتنی گہری نیند میں تھے کہ ٹس سے مس نہ ہوئے ---

عابدہ نے گھر کا ماحول خراب ہونے سے بچانے کے لیے رات کے بچے سالن کے ساتھ روٹی کھائی اور پانی پی کر روزہ رکھ لیا ----

صبح دانش نے ٹھن ٹھن لگا دی کہ آج جمعہ تھا اور اس نے روزہ ضرور رکھنا تھا

اچھا اب زیادہ بک بک نہ کر اور سکون سے ناشتہ کرنے دے ---

امتیاز نے اسے گھر کا تو وہ منہ بسورتا وہاں سے چلا گیا

عابدہ کا دل کٹ کٹ گیا---میرا بچہ روزہ رکھنا چاہتا تھا اور اس شخص کو یہ بھی پسند نہیں----

کھا پی کر جب امتیاز پھر اندر جا کر لیٹ گیا تو عابدہ کا دل دھک سے رہ گیا ----

آج اس کی پھر کام سے چھٹی ہے کیا؟؟؟ اس سوچ نے عابدہ کو پریشان کر دیا تھا

عابدہ نے چولہا چوکا سمیٹا برتنوں کو باہر کھرے میں رکھا اور اٹھ کر کام سمیٹنے لگی ---

جب وہ سارے کام سمیٹ کر کام پر جانے کے لیے تیار ہو گئی تو امتیاز سے پوچھنے گئی---

کام پر کب جانا ہے؟؟

وہ حاجی صاحب لاہور گئے ہیں کچھ ضروری سامان لینے تو آج چھٹی ہے ----

امتیاز نے جواب دے کر کروٹ بدل لی----عابدہ کے چہرے کی شکنیں اور بڑھ گئیں----ظاہر ہے دیہاڑی دار مزدور کی ایک دن دیہاڑی نہ ملے تو گھر کا چولہا جلانا مشکل تر ہو جاتا ہے---

تو مجھے کالونی چھوڑ آنا !!!

چلی جانا جیسے روز جاتی ہے --- "

چھوڑ آنا ایک ٹائم کا کرایہ بچ جائے گا میرا---

تجھے میں لیٹا ٹھیک نہیں لگتا

چل چل جلدی کر----

بچے سکول جا چکے تھے دروازے کو تالا لگا کر دونوں کالونی جانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے----

جب وہ باجی مریم کے ہاں کام پر پہنچی تو کافی دیر ہو چکی تھی----وہ چپ چاپ سلام کر کے برتن اکٹھے کرنے لگی---مریم نے ایک زوردار گھوری اسے دے کر فروٹ چاٹ کے لیے پھلوں کی کٹائی جاری رکھی ----

عابدہ! آج میں نے جالے اتارنے کا کہا تھا نا تم سے----اب اتنی دیر سے آئی ہو جالے کیا اتریں گے----اور کب صفائی ہو گی---

لہجے میں ناراضی لئے مریم باجی نے پوچھا تھا----

وہ آنٹی راحت نے کچھ کپڑے استری کرنے کا کہہ دیا نکلتے ہوئے----اس لیے دیر ہو گئی

کل پکا کر دوں گی ساری جھاڑ پونچھ -----

عابدہ لاؤنج میں سے چیزیں ہٹا ہٹا کر جھاڑو لگا رہی تھی اتنے میں مریم باجی کا فون بجا تھا ----

ہاں جی!!! ظاہر ہے بھئی---مریم باجی فون پر بات کرنے لگیں۔

عابدہ اکثر ان کی باتیں بہت غور سے سنتی تھی اور ان سے کافی متاثر ہوتی تھی----باقی باجیوں کی نسبت وہ ہر حال میں اسلام پر عمل کرنے کی کوشش کرتی تھیں تو عابدہ کو بہت اچھی لگتیں----مریم باجی جو باتیں کرتی وہ تو اس کے توہم پرستی کے مارے ماحول نے کبھی سوچا بھی نہ تھا-----مگر عابدہ نے کئی دفعہ محسوس کیا تھا کہ جس طرح اُسے ہر وقت لوگ کیا کہیں گے

کی فکر لگی رہتی تھی----مریم باجی کی زندگی میں یہ سیاپا نہ ہونے کے برابر تھا اس نے کان لگا سننے کی کوشش کی کہ مریم باجی کیا بات کر رہی ہیں مگر اتنے میں رحماء کی آواز اونچی ہو گئی----وہ کہہ رہی تھی کہ عید تو روزہ داروں کی ہوتی ہے---بے روزوں کو عید منانے کی کوئی ضرورت نہیں---

مریم باجی نے فون بند کیا---عابدہ کا خیال تھا کہ اب مریم رحماء کی بات کی نفی کرے گی----عید تو سب مسلمانوں کی ہوتی ہے---کیا روزہ دار اور کیا بے روزہ لوگ----

لیکن اسے مریم کی بات سن کر بہت حیرت ہوئی

ہاں جی بیٹا!!! عید تو اصل میں روزوں ہی کا انعام ہے---جب انسان اپنے اللہ کے لیے بھوک پیاس برداشت کرتا ہے اور اپنی برائیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے----تو ہی عید کی اصل لذت کو پاتا ہے----رحماء کا سنہرا رنگ اور چمکنے لگا ---

لیکن بیٹا!!! باجی مریم ایک گہری سانس لے کر بولیں.

ہمیں یہ بات دوسروں کو کہہ کر ان کی دل آزاری نہیں کرنی چاہیے--بلکہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ کریم ان کو سچے دل سے روزہ رکھنے کی توفیق دے--

رحماء اپنی کتابیں سمیٹ کر اندر جا چکی تھی اور مریم باجی سالن کے لیے پیاز چیر رہی تھیں ----

باجی!! یہ دل آزاری کیا ہوتی ہے؟؟؟ عابدہ نے جھجھکتے ہوئے پوچھا کیونکہ ساری بات میں سے اسے اسی لفظ کی سمجھ نہیں آئی تھی----

مریم نے ہنس کر عابدہ کی طرف دیکھا----

اچھا! تو تم میری باتیں سن رہیں تھیں---عابدہ کھسیانی سی ہو گئی

دل آزاری کا مطلب ہے کسی کے دل کو تکلیف دینا ---

مطبل----امتیاز رات دن جو میری کرتا ہے اسے دل آزاری کہتے ہیں.

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی دبا دبا کر ٹاکیاں پھیرنے لگی ----

رات کو سب کاموں سے فارغ ہو کر جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو جسم کا جوڑ جوڑ درد سے بلبلا اٹھا ---

امتیاز جو کہ کب کا سو چکا تھا---کروٹ لے کر اسکی طرف منہ کر کے بولا

ہو گئی فارغ تو؟؟؟ چل آ زرا میری ٹانگیں دبا دے----

عابدہ کے صبر نے جواب دے دیا

نا میں انسان نہیں ہوں----میں تھکتی نہیں ----

زبان چلائی تو کھینچ کر پکڑا دوں گا----خاوند کیا ہوتا ہے

یہ بھی پوچھ لینا تھا اس مولویانی باجی سے----امتیاز نے طیش میں آ کر اسے زوردار لات ماری تھی ----

عابدہ نے بھل بھل آنسو بہاتی آنکھیں بند کر لی تھیں----اور اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی

نہ وہ اس ہڈ حرام خاوند کی ٹانگیں دبانے اٹھی اور نہ ہی اس دل آزاری کرنے والے نے دوبارہ کچھ کہا ---

مگر اس سب کے نتیجے میں وہ بڑی دیر جاگتی رہی اور پھر سحری کے وقت اس کی آنکھ نہ کھل سکی ---

ایک دن اس نے مریم باجی کو کہتے سنا تھا کہ اگر فجر کے وقت آنکھ نہ کھلے تو جب آنکھ کھلے فوری نماز فجر پڑھ لینی چاہیے---اس نے وضو کیا اور نماز پڑھنے لگی----

یہ کون سے وقت کی نماز ہے تیری؟؟؟ امتیاز تھانے داروں کی طرح کھڑا تھا ----

کچھ نہیں ---

تو کیا بنتی جا رہی ہے----یہ کون سا دین پڑھا رہی ہے تیری وہ باجی تجھے ----

امتیاز---اللہ آلیا مینوں کم کرن دے----عابدہ کا سر پھٹ رہا تھا درد سے----وہ مشین کی طرح کاموں میں جت گئی تھی -----

صبح عید تھی سارے کاموں سے فارغ ہو کر عابدہ نے مریم سے رخصت مانگی----مریم نے اسے عیدی کے نام پر خاصی معقول رقم دی اور بچوں کی مٹھائی کے لیے علیحدہ پیسے دیئے ----

باجی!!!میری عید ہے نا؟؟؟ مریم کاموں میں الجھی ہوئی تھی.

کیا مطلب !!!

مطبل----جو اس دن رحماء بیٹی کہہ رہی تھی کہ عید روزوں کا انعام ہے---میرے تو ٹوٹے پھوٹے روزے ہیں اور موئی کی نمازیں ہیں ---

ارے عابدہ!!!رحماء تمہیں تھوڑا کہہ رہی تھی تم دل برا نہ کرو---جن حالات میں تم رہتی ہو----تم نے کوشش کی وہ بہت بڑی بات ہے---مریم نے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا----

دل آزاری کرنے والے کی عید ہوتی ہے باجی؟؟؟عابدہ کے دل کا درد باہر آگیا تھا----

اور مریم سناٹے میں آگئی تھی ۔۔۔

مدرسے کے در و دیوار ایک معصوم کی آخری ہچکیوں سے لرز رہے تھے۔ ہال میں موجود سو سے زائد بچے شدید خوف و ہراس کے عالم میں یوں ساکت و جامد تھے، جیسے وہ جیتے جاگتے انسان نہیں، خوف کے سانچے میں ڈھلے مٹی کے بے جان بت ہوں جن کے لیے سانس لینا بھی گناہ ہو۔

سبق یاد نہ ہونے کی پاداش میں، قاری کی کرخت آواز کسی درندے کی دھاڑ بن کر گونج رہی تھی۔ وہ آٹھ سالہ حسین پر مسلسل بہیمانہ تشدد کر رہا تھا۔ تھپڑ، مکے، لاتیں اور پھر ڈنڈوں کی وہ برسات کہ معصوم بچے کا نازک گورا بدن نیلا پڑ گیا۔ فرش پر پڑا حسین مچھلی کی طرح تڑپتا رہا، فریاد کرتا رہا، مگر شقی القلب قاری رحم کے مفہوم سے ناآشنا تھا۔ طیش کے عالم میں اس کے منہ سے جھاگ اڑ رہی تھی اور وہ کسی جنونی کی طرح اس ننھی سی جان کو کچلنے پر تلا ہوا تھا۔

اپنے سگے بھائی کو لہولہان دیکھ کر سات سالہ حسن کے حلق سے ایک لرزتی ہوئی چیخ نکل گئی۔ قاری نے خونخوار نظروں سے حسن کی جانب دیکھا تو بچے کا پتا پانی ہو گیا۔ اس نے ڈر کے مارے آنکھیں میچ لیں، جیسے موت کو سامنے دیکھ لیا ہو۔

قاری نے حسن کی طرف لاٹھی لہرائی اور ہانپتے ہوئے غرا کر بولا:

" تمہارے باپ نے کہہ رکھا ہے کہ اگر... اگر میرے بیٹے سبق یاد نہ کریں تو... تو انہیں زندہ مت چھوڑنا... آج اگر تو نے بھی سبق پکا نہ کیا تو میں تیری بھی چمڑی ادھیڑ دوں گا "!

یہ کہہ کر اس نے دوبارہ فرش پر ادھ موئے پڑے حسین پر لاتوں اور ڈنڈوں کی بارش کر دی۔ قاری کی دھمکی اور اپنے بھائی کی درگت دیکھ کر حسن کو محسوس ہوا جیسے اس کی اپنی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر رہی ہو۔ شدید سردی کے باوجود اس کا چھوٹا سا وجود پسینے میں شرابور تھا۔

اس نے انتہائی خوف کے عالم میں ادھ کھلی آنکھوں اور جھکی ہوئی گردن کے ساتھ قاری کی جانب دیکھنے کی کوشش کی تو اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے اور رحل پر رکھے ہوئے کلام پاک کے ورق پر جا گرے۔ اس نے تھر تھراتے ہاتھوں سے رحل پر رکھے ہوئے قرآن پاک کو اوپر اٹھایا، اسے بوسہ دیا، ورق پر گرے ہوئے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں سے صاف کیا۔ اس نے ہچکی بھری سرد آہ بھری تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا، " یا اللہ "! مگر اس کی یہ معصوم پکار غصے میں بپھرے جنونی قاری کے شور میں دب کر رہ گئی۔

حسین پر کافی دیر تک مسلسل تشدد کرنے کے باعث قاری تھک گیا تو لاٹھی کے سہارے کھڑا ہو کر ہانپنے لگا۔ کچھ دیر ہانپنے کے بعد وہ نڈھال ہو کر فرش پر بیٹھ گیا، شدید غصے کے عالم میں اس کے ہونٹوں سے اب بھی جھاگ ٹپک رہی تھی۔

ہال میں قبرستان جیسی خاموشی چھا گئی۔ فرش پر پڑے حسین میں اب تڑپنے کی سکت بھی نہ تھی۔ وہ بمشکل آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا، وقفے وقفے سے جب وہ درد کی شدت سے سانس کھینچتا تو اس کا سینہ اوپر کو ابھرتا اور پیٹھ فرش سے جدا ہو جاتی۔ مدرسے کے ہال میں اب ہو کا عالم تھا گویا وہاں کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو، بس سو کے قریب بے زبان کیڑے مکوڑے بیٹھے ہوں۔ فرش پر بے سدھ پڑے معصوم حسین نے ایک بڑی مشکل سے لمبی سانس لی اور نحیف آواز میں پکارا، " پانی... پانی "!...

حسن کے کانوں تک جیسے ہی اپنے بھائی کی آواز پہنچی تو اس سے رہا نہ گیا، وہ بھائی کو زندگی کا ایک گھونٹ دینے کے لیے تڑپ کر اٹھا، قاری نے غضب ناک ہو کر پاس پڑی لاٹھی اٹھا کر اسے کھینچ ماری جو سیدھی جا کر حسن کے سر پر لگی اور بچہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ قاری کچھ دیر ہانپتا اور منہ سے جھاگ بہاتا رہا اور پھر تمام بچوں کی جانب دیکھتے ہوئے کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز میں چنگھاڑا، " تم سب کو سانپ سونگھ گیا ہے کیا؟... چپ کیوں بیٹھے ہو حرام زادو... سبق یاد کرو ورنہ تم سب کا بھی برا حشر کر دوں گا "!

قاری کی دھمکی سن کر بچوں نے دہشت کے مارے اونچی آواز میں سبق دہرانا شروع کر دیا۔ حسن نے اپنے زخمی سر پر ہاتھ رکھا پھر بے بسی سے ایک نظر سامنے فرش پر پڑے زخمی بھائی کی طرف دیکھا۔ اور پھر وہ بھی دیگر بچوں کے ساتھ بیٹھ کر سبق یاد کرنے بیٹھ گیا مگر الفاظ اس کے حلق میں کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ وہ سبق یاد کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے روتا اور اپنی معصوم آنکھوں سے بہنے والے آنسو اپنی قمیض کی آستین سے پونچھتا رہا۔ بیچ بیچ میں وہ قاری سے نظر بچا کر سامنے فرش پر پڑے اپنے بھائی کو دیکھ لیتا، جس کی سانسوں کی رفتار اب لمحہ بہ لمحہ مدھم پڑتی جا رہی تھی... اور پھر جب اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی نے ایک آخری لمبی سانس لی اور اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی ہے تو بے اختیار اٹھا اور دیوانہ وار بھاگ کر بھائی کے بے حس و حرکت جسم کو جھنجھوڑنے لگا۔

" ادا... ادا... اٹھو نا "! مگر وہاں خاموشی تھی۔ اس نے گھبرا کر قاری کی طرف دیکھا اور ایک وحشت ناک چیخ ماری، " ادا مر گیا... تم نے میرے بھائی کو مار ڈالا... ! تم نے میرے بھائی کو مار ڈالا "!...

قاری اپنی جگہ سے اٹھا، اس نے حسن کو پرے دھکیلا اور حسین کو ہلایا، اس کے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر سانس محسوس کرنے کی کوشش کی، نبض ٹٹولی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ حسین کی روح پرواز کر چکی ہے، تب اس نے کچھ سوچ کر، ایک طالب علم کو آواز دی اور اسے حسین کے باپ کو بلا لانے کے لیے بھیج دیا۔

قاری مدرسے کے دروازے پر مرنے والے بچے کے باپ کا انتظار کر رہا تھا۔ باپ پہنچا تو قاری نے آگے بڑھ کر سپاٹ لہجے میں کہا، " آپ نے خود کہا تھا کہ اگر آپ کے بیٹے سبق یاد نہ کریں تو میں ان پر سختی کروں، بھلے وہ مر ہی کیوں نہ جائیں۔"

باپ نے بے حسی کی انتہا کرتے ہوئے جواب دیا، " جی ہاں، بالکل میں نے کہا تھا، مگر ہوا کیا ہے؟"

قاری نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا،

" آپ کا ایک بیٹا مر چکا ہے اور دوسرا اس کی لاش کے پاس بیٹھا ہے"!

باپ مدرسے میں داخل ہوا۔

اس نے آٹھ سالہ بیٹے کی لاش گود میں اٹھائی اور دوسرے بیٹے کا ہاتھ تھام کر خاموشی سے ایسے باہر نکلا جیسے دکان سے سودا سلف لے کر نکل رہا ہو۔

گھر میں ماتم برپا تھا۔ آٹھ سالہ معصوم کی لاش پر بین کرتی ماں نے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے دہائی دی" : تم پولیس کے پاس جا کر قاری کے خلاف قتل کی رپورٹ درج کیوں نہیں کرواتے؟ اس ظالم کو سزا کیوں نہیں دلواتے؟"

باپ نے سکون سے جواب دیا" :اس میں قاری صاحب کا کیا قصور؟ میرے بیٹے نے سبق یاد کرتے ہوئے شہادت پائی ہے، اس لیے میں کوئی رپورٹ درج نہیں کرواؤں گا۔ مجھے قاری صاحب کے خلاف رپورٹ درج کروا کے بھلا اپنی قیامت کالی کروانی ہے کیا"!

معصوم حسن کی ماں اپنے شوہر کی جہالت سے واقف تھی اور شوہر کی غلامی کے باعث اس کے پاس سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ زہر کا یہ گھونٹ پینا اس کی مجبوری تھی۔

شام کو ننھے حسین کی تدفین کر دی گئی۔

رات کو حسین کے چھوٹے بھائی حسن نے ماں کی گود میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرتے ہوئے کہا، " اماں، مجھے ادا حسین کی بہت یاد آ رہی ہے"!

ماں کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔

حسن نے معصومیت سے پوچھا، " اماں، مرنے کے بعد انسان اللہ میاں کے پاس چلا جاتا ہے نا۔۔۔؟"

ماں نے سسکتے ہوئے جواب دیا، " ہاں میرے لال"!

حسن بولا، " میں بھی مرنا چاہتا ہوں اماں۔۔۔"!

ایک بیٹے کی موت کے صدمے سے نڈھال ماں چھوٹے بیٹے کے منہ سے نکلی بات سن کر تڑپ اٹھی، " ایسا نہیں کہتے میرے لال"!

حسن نے لمبی سانس لے کر کہا،" مجھے اللہ میاں سے ایک ضروری کام ہے،اس کے لیے میرا اللہ میاں پاس جانا بہت ضروری ہے"!

ماں نے شدید کرب سے پوچھا،" کیا کام ہے تمہارا اللہ پاک سے؟"

ننھے حسن نے غم کی شدت سے جواب دیا،" میں جا کر اللہ میاں کو بتاؤں گا کہ قاری کے ساتھ میرا بابا بھی میرے بھائی کے قتل میں شامل ہے"!

ماں نے خوفزدہ ہو کر حسن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا،" تیرے بابا نے یہ بات سن لی تو تجھے مار ڈالے گا۔کل سے وہ تجھے پھر مدرسے بھیجے گا"!

سات سالہ معصوم حسن نے ایک جھٹکے سے ماں کا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹایا،اس کی چیخ درودیوار کو چیر گئی،" بابا مجھے بھلے مار ڈالے ... مگر... مگر اماں!میں اب کبھی مدرسے نہیں جاؤں گا،کبھی نہیں۔۔"!.

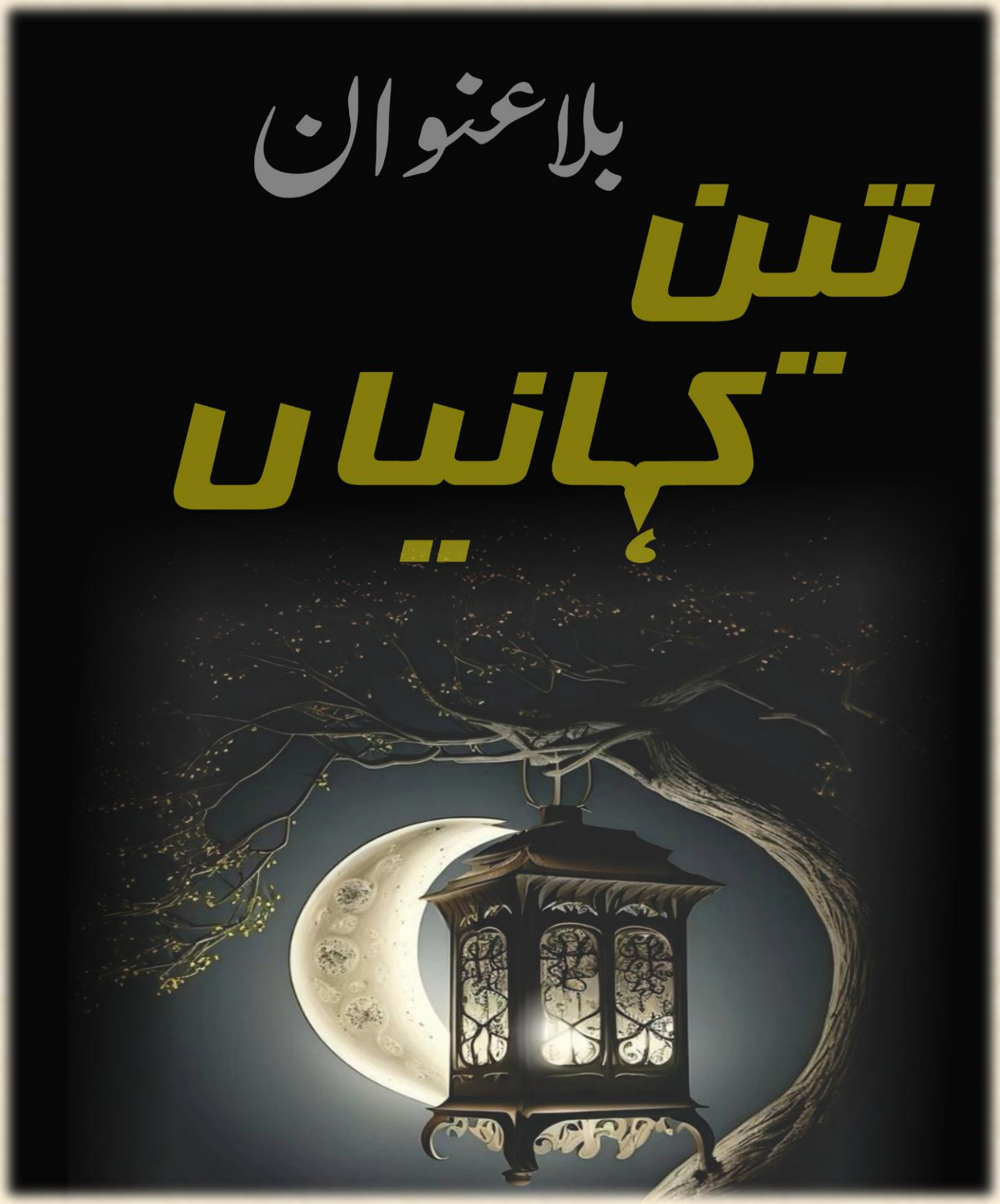
بلا عنوان
تین
کہانیاں

پہلی کہانی

وہ آفس سے نکل کر اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے اسد کو کار میں بیٹھا دیکھا۔

بلیک گلاسز لگائے وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر اس نے اس کے لیے دروازہ کھولا،

گردن ذرا جھکا کر دل پر ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے بولا "میری ہونے والی بیگم کو... کیا میں لفٹ دے سکتا ہوں؟"

کار میں بیٹھتے ہی اس نے پوچھا" : کیا ہوا اسد؟ سب خیریت تو ہے نا؟"

اسد نے ہلکی سی سانس لی اور کہا "میری بس ایک خواہش ہے ...شادی والے دن تم عروسی جوڑا میری پسند کا پہنو۔

سوچو، جب میں تمہیں اس جوڑے میں دیکھوں گا تو مجھے کتنی خوشی ہو گی"...

وہ ہنس پڑی، تھوڑا جھجکی، تھوڑا شرمائی۔

اسد نے نرمی سے کہا " بس گھر کال کر دینا کہ آج لیٹ ہو جاؤ گی۔ پہلے کہیں باہر کھانا کھائیں گے، پھر اسی شاپنگ سینٹر چلیں گے—

اسی دکان پر، جہاں سے امی تمہارے شادی کے کپڑے خریدیں گی۔"

"میں بس اپنی پسند کا جوڑا تم پر رکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں ...بس دیکھنا۔"

لڑکی لمحہ بھر کو خاموش ہو گئی۔

اس کے چہرے پر چھائی خوشی صاف نظر آ رہی تھی۔

پھر آہستہ سے بولی "ٹھیک ہے... چلیں"

دوسری کہانی

وہ نمائش کے اسٹاپ پر موٹر سائیکل روکے کھڑا تھا۔بی کام کے بعد آگے پڑھنے کا خواب تھا، مگر گھر کے حالات خوابوں سے پہلے آ کھڑے ہوئے۔
اسی لیے نوکری کے بعد شام چھ سے رات گیارہ بجے تک وہ بائیکیا چلاتا تھا۔
امید تھی کہ کبھی تو ایم بی اے ایوننگ کی فیس جمع ہو جائے گی۔ آج آٹھ بج گئے تھے، مگر کوئی رائیڈ نہیں ملی تھی۔
یہ کام قسمت سے جڑا ہوتا ہے انتظار کی سولی پر لٹکنا... اور آتے جاتے لوگوں کو امید بھری نظروں سے دیکھنا اور آنکھوں آنکھوں سے پوچھنا اور اپنی عزت نفس رکھتے ہوئے کبھی ہلکی آواز میں بائیکیا کا نعرہ بلند کرنا۔
پھر ایک نوجوان آیا اور موبائل مارکیٹ چلنے کو کہا۔
وہ فوراً مان گیا۔
آگے سے بات نارتھ ناظم آباد تک پہنچی ۔پر اس نے کہا کہ موبائل لینے کے بعد وہ آگے ایک اور مارکیٹ جائے گا وہاں بھی کچھ دیر کا کام ہے۔
تو اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔
لمبی سواری تھی، پھر ناظم آباد سے اس کا گھر بھی قریب تھا۔کمائی اچھی ہونی تھی۔
مارکیٹ پہنچ کر سواری نے کہا "آپ یہی رکیں، میں ابھی آیا۔"
وہ منافع کا حساب لگانے لگا، موٹر سائیکل کی مرمت یاد آئی، کراچی کی خراب سڑکوں کی وجہ سے موٹر سائیکل کی مرمت کا کام آئے دن نکلتا رہتا تھا۔
پھر سوچا کیوں نہ گھر کے لیے چائے کے کپ ہی لے لوں — یہاں سستے مل جاتے ہیں۔
اور وہ بھی مارکیٹ کے اندر چلا گیا۔

تیسری کہانی

آج وہ بے حد خوش تھا۔

زندگی کی پہلی تنخواہ ملی تھی۔ماں گھروں میں کام کرتی تھی،ایک چھوٹی بہن تھی، کرائے کا گھر تھا۔

ماں جہاں کام کرتی تھی اس گھر کے مالک نے وعدہ کیا تھا کہ شناختی کارڈ بنتے ہی دکان پر رکھ لے گا۔چائے، کھانا سب وہی دیتا تھا۔

اس کا خواب تھا کہ اب وہ آگے پرائیویٹ پڑھے گا۔

بار بار گھڑی دیکھتا، بس دس بج جائیں اور وہ اڑ کر گھر پہنچے۔ماں کے ہاتھ میں پہلی تنخواہ رکھے اور اس کی آنکھوں میں

وہ چمک دیکھے جس کا وہ برسوں سے قرض دار تھا۔جیسے ہی دس بجے،اس نے دکان سمیٹنی شروع کی۔

دروازہ بند کیا اور باہر قدم رکھا کہ—

یہ گل پلازہ کی وہ کہانیاں ہیں۔جو شاید کبھی خبر نہ بن سکیں۔جہاں صرف دکانیں نہیں جلیں، بلکہ انتظار، منصوبے اور خواب راکھ ہو گئے۔

کچھ لوگ خریداری کے لیے آئے تھے،کچھ کمائی کے لیے،اور کچھ اپنی زندگی کے سب سے خوشگوار لمحے کے ساتھ۔

گل پلازہ میں صرف ایک عمارت نہیں گری—

وہ لمحے بھی دب گئے جن کا کوئی متبادل زندگی میں دوبارہ نہیں ملتا۔

اس کا اسٹوڈیو گیلری ہی میں تھا۔

گیلری میں رنگوں کی باس, پینٹنگز دیواروں پر اڑھے ترچھے ایسے لٹکے تھے ۔ جیسے برسہابرس منتشر یادیں۔

وہ ایک عام دوپہر کی طرح اج بھی سٹوڈیو کے اندر کام میں مگن تھا۔

باہر گاڑی رکنے کی اواز آئی ایک لمبا تر نگا بزرگ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

وضع قطع سے وہ کوئی عام انسان نہیں لگ رہا تھا۔

اس کے چہرے پہ مصنوعی رعب کیساتھ کرختگی اور لباس کی نفاست سے یہ اندازہ لگانا اسان تھا کہ موصوف کوئی ریٹائرڈ بیوروکریٹ یا ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتا ہے۔ جو ہر قدم پر اپنی زندگی کے فیصلوں کی چھاپ لیے چلتا تھا۔

دور سے پینٹنگز کا نظارہ کیا، پھر مختصر سا سوال کیا "ایک پینٹنگ کتنے کی ہے؟" بظاہر مختصر، مگر چبھنے والا سوال تھا جس کی اسے عادت ہو گئی تھے کہ یہ معمول بن گیا ہے۔ آس نے بے دلی سے صرف ہاتھ کے اشارہ سے اس کی توجہ پینٹنگ پر لگی ٹیگ کی طرف مبذول کرائی۔

ٹیگ پر لکھی دھندلی لکھائی دیکھنے وہ نزدیک گیا ۔ اپنا قیمتی چشمہ نکالا، اور کن انکھوں سے ہر ایک ٹیگ کو باری باری دیکھنے لگا—

ہر ٹیگ کو دیکھ کر چہرے کے تاثرات بگڑتے گئے۔

پہلے بھنویں اوپر اٹھیں، پھر آنکھیں سکڑ گئیں، آخر کار ایک ہلکی سی کھنکار کے ساتھ اس نے ہڑبڑا کر کہا" ان کی قیمتیں کچھ عجیب ہیں"

میں پھر اوں گا افی الحال میں کسی تقریب میں جا رہا ہوں ۔

آرٹسٹ نے خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، اس کے چہرے کے پیچھے ایک پوری ریاست اور سوسائٹی کا بے اعتنائی والا مکروہ چہرہ نظر آنے لگا، جو ہر چیز کو ریٹ میں بدل دیتی ہے۔

اس نے آہستگی سے کہا

"جناب... یہ صرف پینٹنگ نہیں ہے۔"

وہ سن کر مسکرایا،

مسکراہٹ میں بھی کرختگی تھی

"میں سمجھتا ہوں... لیکن... آخر ہے تو پینٹنگ ہی نا۔"

یہ جملہ آرٹسٹ کے اندر کسی کیل کی طرح اترا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

پھر اس نے کہا آخر ہم بھی تو آرٹ کے شوقین ہیں۔"

آرٹسٹ مسکرا اٹھا اس کی مسکراہٹ میں وہی پوری سوسائٹی پر طنز تھا۔

شوقین وہ ہوتا ہے جو آرٹ کی قیمت نہیں پوچھتا بلکہ آرٹ کو انمول سمجھتا ھے، مگر آپ ایسے آرٹ کو بوجھ سمجھتے ہیں،

اس نے دل ہی دل میں جواب دیا

ادمی نے رومال نکالا، پیشانی کا پسینہ صاف کیا،

جیسے اس نے سن لیا ہو "میں... واپس آؤں گا۔" یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا،

جیسے قیمتیں نہیں اپنا ضمیر دیکھ کر گھبرا گیا ہو۔

دروازہ بند ہوا تو کمرے میں خاموشی اتر گئی۔ آرٹسٹ آہستہ آہستہ پینٹنگز کے پاس گیا، ایک پینٹنگ کی ٹیگ نیچے گر چکی تھی۔ اس نے جھک کر ٹیگ اٹھایا، دھندلی لکھائی پر انگلی سے گرد و غبار صاف کیا، اور الفاظ آہستہ آہستہ واضح ہوئے۔

قیمت: دس کلو اٹا

آرٹسٹ نے ٹیگ کو دوبارہ پینٹنگ کے ساتھ چسپاں کیا، ہاتھ پیچھے کھینچا، اور اس لمحے اسے لگا... کسی نے اس کے دل کی دیوار پہ بھی زور سے کوئی چیز چسپاں کر دی۔ اس کی نظر دروازے کے ساتھ پرانے بورڈ پر پڑی، اس پہ موٹے حروف میں لکھا تھا

"Painting For Sale" آرٹسٹ نے اسے اٹھایا،

کچھ دیر پکڑے رکھا، پھر ایک کونے میں الٹا کر کے رکھ دیا،

جیسے اپنی روح کو بازار سے واپس لے آیا ہو۔

اس دن، پہلی بار اسے احساس ہوا اس کی پینٹنگ، اس کی محنت، اس کا کرب نہ بیچا جا سکتا ھے، نہ اس قیمت کم کی جا سکتی ھے۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی پینتنگ کے پرائز ٹیگ دیکھنے لگا جن پر پانچ کلو گھی. تین ماہ کی بچوں کے سکول کی فیس، مکان کا کرایہ. اسی اثناء میں وہ کرسی سے اٹھا اور ایک پینٹنگ کو الٹا کر کے رکھ دیا جس پر اس گھر کے معمولات کے اخراجات میں سے کوئی پرائز ٹیگ نہیں تھا بلکہ اس کی ذات کے ساتھ جڑا ٹیگ تھا یعنی

"ایک ماہ کی چائے"

جمعرات کو حیدرآباد سے کراچی جانے کا پروگرام بنا، میرے شوہر کا ڈاکٹر ادیب رضوی صاحب کے پاس چیک اپ ہونا تھا۔ کار کے بجائے ڈائیوو (Daewoo) کی مسافری کو ترجیح دی سوچا کہ راستے میں کچھ نیند پوری کر لیں گے کیونکہ دن تو پورا لگنا ہی تھا!!، پر نیند کیسی؟ جیسے ہی بس میں اندر داخل ہوئے ایک گرجدار آواز سنائی دی، "بابلا بہ گاڑی کب چلے گی؟" بڑے میاں قدر آور، صاف ستھرے کپڑے، ہلکی سی سفید داڑھی، ہاتھ میں ایک چھوٹا شاپر اور ڈان اخبار پکڑ کر اگلی سیٹ پر براجمان تھے، ان کی بے چینی قابل دید تھی، ڈرائیور نے ان کے سوال پر ٹھنڈے انداز سے کہا، "بزرگو! ابھی تو بیٹھے ہو گاڑی اپنے وقت پر چلے گی"۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈائیوو حیدرآباد سے کراچی کے روٹ پر رواں ہو گئی۔ بڑے میاں موبائیل پر کسی کو ہدایت دینے لگے، کہ "ابھی روانہ ہوئے ہیں، ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے پہنچیں گے تاج کامپلیکس پر لینے آجانا" کچھ ہی دیر گذری پھر ان کی پاٹ دار آواز کی خاموشی کو توڑتی ہوئی کانوں پر پڑی جس میں وہ ہدایات دے رہے تھے کہ، "پورے وقت پر تاج کامپلیکس پر آنا مجھے انتظار نہ کرنا پڑے" سامنے والے فرد کو یاد دِلانے کے بعد انہوں نے ڈان اخبار کا مطالعہ کرنا شروع کیا، چند ہی لمحوں میں اونگھنے لگے بلکہ سو ہی گئے۔ وہ تو سو گئے پر میری نیند اڑ گئی، مجھے فکر لاحق ہو گئی کہ یہ شخص کم از کم پچھتر برس کا ہو گا اس کا اکیلے سفر کرنا فقط موبائل کے سہارے؟!!

بات چیت اور رکھ رکھاؤ سے تو وہ کھاتے پیتے گھرانے کا پڑھا لکھا اور باحیثیت بندہ لگ رہا ہے اپنی ذاتی گاڑی میں جا سکتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں اس نے اس طرح سفر کرنا موزوں سمجھا ہے۔ اب اکیلا اور پریشان بھی ہے ڈائیوو کے سہراب گوٹھ پہنچنے سے پہلے بڑے میاں نیند سے اٹھ کر اپنی بے چین طبیعت کے مطابق سب سے پہلے بس میں سے اُترے شٹل کی ٹکٹ سب سے پہلے لے کر باہر دیکھنے لگے ہم لوگ سب اندر ہی تھے۔ چند پل دھوپ میں کھڑے رہے پھر آکر سائے میں پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاتے، دس منٹ میں تقریباً سب لوگ باہر شٹل کے انتظار میں ساتھ ہی کھڑے تھے پھر پاس والوں کو بڑی آواز میں کہنے لگے "پتہ نہیں کیا مسئلہ ہے؟ شٹل کیوں نہیں چل رہی؟" اپنے آپ بڑبڑانے لگے، ڈرائیور بھی تو نظر نہیں آرہا کیسے چلے گی؟ پتہ نہیں کب چلے گی" باقی ان کے اس طرح کے اپنے آپ سے سوالات کرنے پر مجھے یہ پتہ چلا کہ بندہ سندھی اسپیکنگ ہے۔

پے در پے دو تین شٹلز آ گئیں اتفاق سے ہم اُسی شٹل میں بیٹھے جس میں بڑے میاں تھے اور اس وقت ہم سات تھے بیٹھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی بڑے میاں نے آگے بیٹھے ہوئے فرد سے گذارش کی کہ وہ ڈرائیور کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھنا پسند کرے گا اگر آپ کو اعتراض نہ ہو، فاروق نوجوان نے انہیں اپنی سیٹ دی بڑے صاحب ان کی بیوی صائمہ کے ساتھ بیٹھ گئے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے، "میری آپ کے جیسی دو بیٹیاں ہیں، تم بھی میری بیٹی ہو"، اس طرح صدر تک پہنچنے کے پینتیس منٹ کے دوران فاروق اور صائمہ کی ان سے دوستی ہو گئی۔ ہم سب بھی ان کی باتوں سے محفوظ ہونے لگے، پھر گویا ہوئے، "بیٹیاں بہت اچھی ہوتی ہیں ماں باپ کا مان ہوتی ہیں مجھے میری بیٹیاں بہت یاد کرتی ہیں"۔

صائمہ کی گود میں پیاری سی بچی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے "آپ کی ایک بیٹی ہے؟" فاروق نے بیٹے کی کمی کی وجہ دھیمی آواز میں کہا،

"ہاں ایک ہی بیٹی ہے"، "ارے! ایک ہی سے کیا مطلب ہے بابا؟ بیٹی نعمت ہے یہ ایک ہی بہت ہے، کیا کرو گے زیادہ بچے پیدا کر کے اس بیٹی کو بہت اچھی تعلیم دلواؤ اچھا انسان بناؤ ایک ہی بہت ہے" انہوں نے گرجدار آواز میں سمجھاتے ہوئے کہا، فاروق استفہامیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا، وہ بات سمجھ گئے دوبار گویا ہوئے

"دنیا میں سب سے احسان فراموش رشتہ اولاد کا ہے کیا کرو گے اپنا خون سینچ کر انہیں پال پوس کر یہ تو بڑھاپے کی پریشانی ہیں" میں نے اپنے شوہر کو آہستہ سے کہا، "لگتا ہے بڑے میاں اپنے اولاد سے بہت دلبرداشتہ ہیں پتہ نہیں کتنے بچے ہیں؟"

فاروق سے رہا نہ گیا، "بڑے سائیں! آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

ایک ٹھنڈی سی سانس بھرنے کے بعد بولے "میری دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں ایک بیٹا لاہور میں باقی ایک بیٹا اور دو بیٹیاں آمریکا میں ہیں پر میں تو کہوں گا کہ نہ جانے جو اپنی اولاد کو آمریکا بھیجے اس کمبخت آمریکا نے تو مجھ سے میری اولاد ہی چھین لی ہے!!"

ان کے جملے کا ختم ہونا تھا کہ پاس والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہرے دوپٹے والی عورت کے انکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے، وہ سندھی میں ساری بات سمجھ رہی تھی کہنے لگیں "بھائی صاحب! آپ بلکل سو فیصد سچ کہ رہے ہیں، میرا ایک ہی بیٹا ہے اس کو آمریکا جانے کا بہت شوق تھا میں نے خوشی سے اجازت دی وہاں جا کر اس نے آمریکن نیشنل پاکستانی عورت سے شادی کی میرے دل میں اس کے سہرے دیکھنے کے ارمان تو رہ ہی گئے پر بہو یہاں آنا پسند نہیں کرتی بیٹا دبئی تک آتا ہے مجھے وہیں بلاتا ہے میں مہمانوں کی طرح ہوٹل میں چند دن رہ کہ بچوں سے مل کر دوبارہ اکیلی یہاں آ جاتی ہوں"

صائمہ ان کی روائداد سن کر دکھ سے بولی، "یہ تو انسان کے نہیں چڑیاؤں کے بچے ہو گئے جو گھونسلے سے نکلنے کے بعد واپس آنے کے ہی نہیں"۔ چڑیا والی تشبیہ بڑے میاں کو بھا گئی، بھیگی ہوئی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے رونے جیسی آواز میں بولے، "مرغے اچھا کرتے ہیں، اپنے بچوں کو ٹھونگے مار مار کر اوقات یاد دلاتے ہیں" پھر فاروق کو بتانے لگے۔ ب "یٹے کو باہر پڑھنے جانا تھا اس کے لیئے میں نے اونے پونے میں اپنا بہترین بنگلہ بیچ دیا ابھی وہ چار کروڑ سے بھی زیادہ کا ہو گا پر اس بیٹے کو مجھ سے فون پر بات کرنے کا بھی وقت نہیں ہے"۔ بیٹیاں کہتی ہیں کہ "بابا ہمارے پاس آ کر رہیں" پر بابلا! بیٹیوں پر بوجھ تو نہیں ڈالا جا سکتا، نی!! اور میں کیا کروں میری تو جڑیں یہاں کی سرزمین پر جمی ہوئی ہیں" پھر شاہ لطیف کے سرمائی کے بیت کو آلاپنے لگے۔ **"جڑ جنین جے جئی میں لگی ری لھار"**

میں کیسے آمریکا جاؤں مجھے وہاں مزہ نہیں آتا، وہاں تو لوگ مشین ہیں کسی کو کسی کے لئے کوئی وقت ہی نہیں، میری یہاں پر حیدرآباد کے آس پاس زمین ہے۔ سرکاری نوکری سے بیسویں گریڈ میں رٹائر ہوا تھا اچھی خاصی پینشن ملتی ہے۔ اٹھتر سالوں کا ہوں بور نہیں ہوتا خود کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں روزانہ ایک سپارہ قرآن پاک کا پڑھنا میرا معمول ہے۔ کراچی میں اپنا گھر نوکر چاکر، دوست یار، رشتہ دار سب ہیں، اکیلا آتا جاتا ہوں آج حیدرآباد گیا تو بس یہ دوائیں اور چھڑی لے کر گیا کوئی خوف نہیں کوئی غم نہیں پر اس عمر میں آکر احساس ہوا ہے کہ ہر ایک پیسے کا ہے، پیار کہیں بھی نہیں ہے۔ پر اولاد تو اولاد ہے نا کہاں بھول سکتے ہیں!!"

شٹل تاج کامپلیکس پہنچ چکی تھی بڑے میاں صائمہ کی بچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر صائمہ کو دعا دینے لگے، "اللہ تعالیٰ آپ کو مزید اولاد سے نوازے"

میں سوچ میں پڑ گئی اپنے چار بچوں سے خفا ہوتے ہوئے، صائمہ کو ایک بچی کے کافی ہونے کا کہتے ہوئے پھر اور بچوں کی دعا دینے والے بڑے میاں یہ تو نہیں سوچ رہے کہ ابھی اس جوان جوڑے کی زندگی کی شروعات ہے۔ کہیں ان کے دل میں دوسرے بچے کی آس نہ رہ جائے، میرے کانوں میں اپنی دادی کے الفاظ گونجنے لگے، وہ کہا کرتی تھیں، "بابا! اولاد ہے پتھر ماں باپ ہیں موم"

"یہ... نکہت نے ٹیوشن

جانا کیوں بند کر دیا؟" انہوں نے بیگم سے پوچھا۔

"کہہ رہی تھی آنے جانے میں کافی وقت نکل جاتا ہے۔ سیلف اسٹڈی میں زیادہ وقت دے کر تیاری مکمل کر لے گی۔"

"ہمم... اور ندیم کو کیا ہوا؟ دو ہفتوں تک مجھے مناتا رہا کہ اسے اپنے دوستوں کے ساتھ دار جلنگ گھومنے جانا ہے۔ پھر میں نے ہامی بھر لی تو اب جانا نہیں چاہتا" بتا رہا تھا کہ اس کا کچھ دوستوں کے ساتھ جھگڑا ہو گیا ہے۔ اس لیے ان کے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"تعجب ہے۔ "وہ پُر تفکر انداز میں بڑبڑائے۔ تعجب تو پہلے پہل انہیں بھی ہوا تھا۔ "بیگم نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کس بات پر؟ "جب آپ نے اسکوٹی چھوڑ کر سائیکل سے دفتر جانا شروع کر دیا تھا"!

مٹر کے دانے جاوید نہال حشمی

دس سالہ سعدیہ نے عامر کو اپنی جانب ایک ٹک تاکتے ہوئے پایا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں، انکل؟ "اس نے عامر کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

"کک... کچھ نہیں۔ "وہ جلدی سے بولا" بس تمہارا لوگو دیکھ رہا تھا۔ کس اسکول میں پڑھتی ہو؟"

"سینٹ جیمس... یہ ہمارا اسپورٹس یونیفارم ہے۔" اس نے اپنے زرد ٹی شرٹ کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے دن عامر نے اپنی نو سالہ بیٹی فوزیہ کو اپنے پڑوسی عابد صاحب کے یہاں آنے جانے سے منع کر دیا۔ مگر کیوں؟ "عامر کی بیوی نے تعجب سے پوچھا" سعدیہ اور فوزیہ قریبی سہیلیاں ہیں اور ہمیشہ سے ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی رہی ہیں؟" فوزیہ اب بڑی ہو رہی ہے۔ اس طرح غیروں کے گھر آنا جانا مناسب نہیں۔"

"عابد بھائی غیر کب سے ہو گئے؟ آپ جانتے ہیں وہ رشتے داروں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ انہوں نے فوزیہ کو ہمیشہ اپنی بیٹی مانا ہے۔"

"کسی کے دماغ میں کیا ہے، کس نگاہ سے دیکھ رہا ہے یہ تم کیا جانو؟ "اس نے اپنی بیوی سے نگاہیں ملائے بغیر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

تم اگر۔۔۔

کوئی نئی بات کرو

معمول کے خلاف چلو

تو اسے "جدت "اور" نیا پن " کہا جاتا ہے۔

میں اگر۔۔۔ نئی سوچ دوں

نرالے راستے پر چلوں

تو اسے تم بغاوت " اور" بے لگامی " کا نام دیتے ہو۔

جنریشن گیپ کا یہ تضاد

آخر کب تک۔۔۔۔۔!!؟؟

پھر سے دے دو گھاو

شگفتہ شاہ

برش سارے ہو گئے بے جان

قلم نے بھی چھوڑا ساتھ

شاید۔۔۔

سکون مجھے راس نہ آیا۔

اے زندگی۔۔۔۔!

پھر سے دے دو گھاو
روح کو جگانے کی خاطر
کلادیوی کو پربھانے کی خاطر۔۔۔!

ان
سے
ملئے

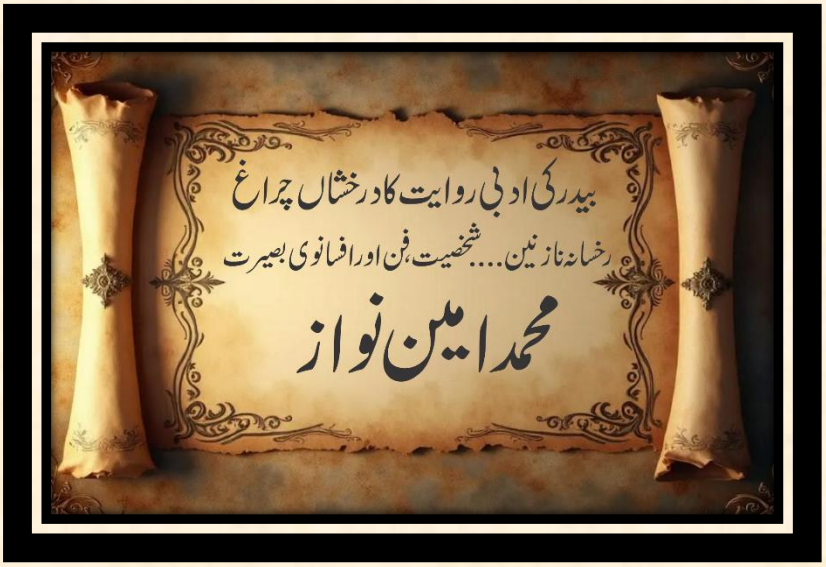

حنائی سرزمین، شہر اردو بیدر تاریخ، تہذیب اور ادب کا وہ زرخیز خطہ ہے جس کی مٹی میں صدیوں کی فکری ریاضت، علمی جستجو اور تہذیبی شائستگی رچی بسی ہے۔ یہ شہر محض قلعوں، مقبروں اور تاریخی آثار کی وجہ سے معروف نہیں، بلکہ اس کی اصل شناخت وہ علمی و ادبی روایت ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ہے۔ بیدر نے اردو زبان و ادب کو وہ فضا عطا کی جہاں فکر کو وقار، احساس کو تہذیب اور اظہار کو شائستگی میسر آئی۔ اسی ادبی فضا میں جن شخصیات نے اپنے قلم سے شہر کی شناخت کو دوام بخشا، ان میں محترمہ رخسانہ نازنین کا نام نہایت احترام اور اعتماد کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ رخسانہ نازنین اردو افسانے کی اس معتبر روایت کی نمائندہ ہیں جہاں فن محض لفظوں کی بازی گری نہیں بلکہ زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کا بامعنی اظہار ہوتا ہے۔ وہ ادبی دنیا کی ان روشن قلم کار خواتین میں شامل ہیں جن کی تخلیقات نہ وقتی تاثر تک محدود ہیں اور نہ محض جذباتی ابال کا نتیجہ، بلکہ فکری پختگی، مشاہدے کی گہرائی اور احساس کی صداقت سے عبارت ہیں۔ ان کی شخصیت میں سادگی، متانت اور سنجیدگی نمایاں ہے، اور یہی اوصاف ان کے افسانوی اسلوب میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ رخسانہ نازنین کا افسانوی سفر کسی مصنوعی تحریک یا ادبی فیشن کی پیداوار نہیں، بلکہ وہ زندگی کے اس کرب سے جنم لیتا ہے جو خاموشی کے ساتھ سماج کے اندر پنپتا رہتا ہے۔ وہ چیخ چیخ کر مسائل بیان کرنے کے بجائے، آہستہ اور گہرے انداز میں قاری کے شعور کو جھنجھوڑتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں بلند آہنگ نعرے نہیں، مگر ایسے سوالات ضرور موجود ہوتے ہیں جو دیر تک ذہن میں گونجتے رہتے ہیں۔ یہی ان کے فن کی اصل طاقت ہے۔ ان کی تحریروں کا بنیادی وصف حقیقت نگاری ہے، مگر یہ حقیقت نگاری خشک یا محض رپورٹنگ کے انداز کی نہیں، بلکہ انسانی جذبوں سے ہم آہنگ، دردمندانہ اور فکری شعور سے آراستہ ہے۔ وہ زندگی کو اس کے پورے سچ کے ساتھ پیش کرتی ہیں نہ اسے غیر ضروری طور پر حسین بناتی ہیں اور نہ ہی جان بوجھ کر سیاہ رنگ میں رنگتی ہیں۔ ان کے افسانے زندگی جیسے ہیں: کہیں مسکراہٹ، کہیں آنسو، کہیں خاموشی اور کہیں مجبوری۔ رخسانہ نازنین کے افسانوی کردار قاری کو اس لیے اجنبی محسوس نہیں ہوتے کہ وہ ہمارے اردگرد بکھرے ہوئے چہروں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ان کے یہاں عورت باورچی خانے کی چہار دیواری میں قید ایک بے نام سایہ نہیں، بلکہ ایک سوچنے سمجھنے والی، محسوس کرنے والی اور کبھی کبھی ٹوٹ جانے

والی مکمل انسان ہے۔ اسی طرح مرد محض جابر یا بے حس نہیں، بلکہ وہ بھی حالات کے جبر، معاشی دباؤ اور سماجی توقعات کے بوجھ تلے دبا ہوا ایک مجبور کردار ہے۔ یہی توازن ان کے افسانوں کو یک رخی ہونے سے بچاتا ہے۔

افسانہ " واپسی " انکے چوتھے افسانوی مجموعے " جینے کے لئے " میں شامل ہے جو عنقریب جلوہ افروز ہو کر منظر عام پر آئے گا ان کے افسانوی مجموعے " طوبیٰ "، " ضیاء "اور " پسِ دیوار "اردو افسانے کے اس سنجیدہ دھارے کی نمائندگی کرتے ہیں جہاں فن اور مقصد ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ہم سفر ہوتے ہیں۔ ان مجموعوں میں شامل افسانے عورت کے داخلی کرب، رشتوں کی پیچیدگی، گھریلو زندگی کے ان کہے دکھ، سماجی رسم و رواج کے دباؤ اور بدلتے ہوئے معاشرتی رویوں کو نہایت گہرے شعور کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ رخسانہ نازنین کا کمال یہ ہے کہ وہ ان موضوعات کو دہراتی نہیں بلکہ ہر بار ایک نئے زاویے، ایک نئی کیفیت اور ایک نئے احساس کے ساتھ سامنے لاتی ہیں۔ افسانہ " واپسی "ان کے فنی شعور کی ایک نمایاں مثال ہے، جہاں انہوں نے متوسط طبقے کے اس المیے کو موضوع بنایا ہے جو آج کے عہد کی سب سے بڑی سماجی حقیقت بن چکا ہے۔ روزگار کی تلاش میں پردیس جانے والا مرد، برسوں کی محنت کے بعد جب وطن لوٹتا ہے تو اسے سکون کے بجائے نئے سوالات، نئی ذمہ داریاں اور نئی مجبوریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شکیل احمد کی کہانی دراصل ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک پورے طبقے کی اجتماعی کہانی ہے، جسے رخسانہ نازنین نے نہایت خاموش مگر اثر انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔ رخسانہ نازنین کے افسانوں میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والا پہلو ان کا نفسیاتی گہراؤ ہے۔ وہ کرداروں کے ظاہر سے زیادہ ان کے باطن پر توجہ دیتی ہیں۔ ان کے یہاں خاموشی بھی بولتی ہے، نظر جھکانا بھی معنی رکھتا ہے اور ادھورا جملہ بھی مکمل کہانی سنا دیتا ہے۔ وہ قاری کو کرداروں کے دل و دماغ میں جھانکنے کا موقع دیتی ہیں، اور یہی عمل افسانے کو محض کہانی نہیں بلکہ تجربہ بنا دیتا ہے۔ ان کی زبان سادہ، شستہ اور رواں ہے، مگر اس سادگی میں فکری پختگی اور ادبی وقار پوری طرح محفوظ رہتا ہے۔ وہ ثقیل الفاظ یا غیر ضروری تشبیہوں کے ذریعے قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتیں، بلکہ عام فہم زبان میں غیر معمولی بات کہنے کا ہنر رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں عام قاری کے دل تک بھی پہنچتی ہیں اور سنجیدہ قارئین کے لیے بھی فکری غذا فراہم کرتی ہیں۔ رخسانہ نازنین کا فن نسوانی ادب کے دائرے میں ضرور آتا ہے، مگر وہ اسے محدود دائرے میں قید نہیں کرتیں۔ ان کا ادب عورت کی آواز ضرور ہے، مگر یہ آواز نفرت، انتقام یا محض احتجاج کی نہیں، بلکہ فہم، شعور اور اصلاح کی آواز ہے۔ وہ سماج کو توڑنے کے بجائے سمجھانے کی قائل ہیں، اور یہی رویہ ان کے ادب کو دیرپا بناتا ہے۔

بیدر کی ادبی روایت میں رخسانہ نازنین کا مقام اس لیے بھی اہم ہے کہ انہوں نے ایک ایسے دور میں سنجیدہ افسانہ نگاری کو زندہ رکھا ہے جب سطحی تحریریں، فوری شہرت اور سوشل میڈیا کی مقبولیت ادب کے معیار کو متاثر کر رہی ہے۔ ایسے ماحول میں ان کا فن ایک مضبوط ستون کی طرح کھڑا نظر آتا ہے، جو ادب کے وقار اور مقصدیت کی یاد دہانی کراتا ہے۔

رخسانہ نازنین نے اپنے افسانوں کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ خاموشی بھی احتجاج ہو سکتی ہے، سادگی بھی گہرائی رکھتی ہے اور عورت کا قلم بھی سماج کی نبض پر ہاتھ رکھ سکتا ہے۔ رخسانہ نازنین کے افسانوی ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت پوری شدت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ ان کی تخلیقات

محض تخیّل کی پرواز نہیں بلکہ زندگی کے ٹھوس تجربات، گہرے مشاہدات اور مسلسل فکری ریاضت کا نتیجہ ہیں۔ وہ افسانہ نگاری کو وقتی جذبات کے اظہار کا وسیلہ نہیں بناتیں بلکہ اسے سماجی شعور کی ترسیل کا معتبر ذریعہ سمجھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے قاری کے دل کو چھونے کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں سوالات بھی بیدار کرتے ہیں، اور یہی سوالات دراصل ادب کی اصل روح ہوتے ہیں۔ رخسانہ نازنین کے افسانوں میں عورت محض مظلوم ہونے کی علامت نہیں بلکہ ایک ایسی ہستی ہے جو حالات سے سمجھوتہ بھی کرتی ہے، مزاحمت بھی، اور بسا اوقات خاموش قربانی کو اپنا مقدر بھی بنا لیتی ہے۔ ان کے یہاں عورت کی تصویر نہ انتہا پسند نسوانیت کا شکار ہے اور نہ روایتی تقدیس میں قید؛ بلکہ ایک متوازن، حساس اور حقیقت پسندانہ کردار کے طور پر ابھرتی ہے۔ یہی اعتدال ان کے افسانوی فن کو سنجیدہ اور قابلِ اعتماد بناتا ہے۔ رخسانہ نازنین کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں کسی ایک کردار کو مکمل طور پر مجرم یا مکمل طور پر معصوم قرار نہیں دیتیں۔ ان کے نزدیک زندگی سیاہ و سفید خانوں میں تقسیم نہیں بلکہ مختلف رنگوں اور سایوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے ان کے مرد کردار بھی یکسر ظالم نہیں ہوتے اور عورتیں بھی محض مظلوم۔ دونوں اپنی اپنی جگہ حالات کے اسیر نظر آتے ہیں، اور یہی حقیقت افسانے کو زندگی کے قریب تر بنا دیتی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے " طوبیٰ "میں شامل کہانیاں ابتدائی فکری پختگی کی غماز ہیں، جہاں مصنفہ نے اپنے موضوعات کے انتخاب میں جرات اور شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ مجموعہ بیدر کی ادبی تاریخ میں اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ شہر کا پہلا باقاعدہ افسانوی مجموعہ ہے جو کسی خاتون قلمکار کی جانب سے سامنے آیا۔ یہ محض ادبی کارنامہ نہیں بلکہ ایک سماجی پیش رفت بھی ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ بیدر کی خواتین بھی ادبی سطح پر اپنی آواز رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔" ضیاء "میں رخسانہ نازنین کا افسانوی اسلوب مزید نکھر کر سامنے آتا ہے۔ یہاں ان کی زبان میں روانی، کرداروں میں گہرائی اور موضوعات میں وسعت نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہی وہ مجموعہ ہے جسے بہار اردو اکادمی کی جانب سے انعام کے لیے منتخب کیا جانا ان کے فنی وقار کا عملی اعتراف ہے۔ یہ مجموعہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی تحریر محض علاقائی سطح تک محدود نہیں بلکہ قومی سطح پر بھی قدر و منزلت کی حامل ہے۔" پسِ دیوار "ان کے فکری سفر کا وہ مرحلہ ہے جہاں ان کا فن مزید سنجیدہ اور تہہ دار ہو جاتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانے سماج کے ان پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں جو عموماً نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں عورت کے داخلی کرب، سماجی منافقت، معاشی ناہمواری اور اخلاقی زوال کو نہایت سلیقے سے افسانوی قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے ہونا بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ ریاستی سطح پر ان کی ادبی خدمات کو تسلیم کیا گیا ہے۔

رخسانہ نازنین کے افسانوں میں اصلاح کا عنصر نمایاں ضرور ہے، مگر وہ وعظ و نصیحت کے انداز سے کوسوں دور رہتی ہیں۔ وہ قاری کو براہ راست حکم نہیں دیتیں بلکہ کہانی کے ذریعے سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ یہی اسلوب افسانے کو ادب بناتا ہے، محض تبلیغ نہیں۔ وہ سماج کی برائیوں کی نشاندہی ضرور کرتی ہیں، مگر ان کا قلم نفرت یا تلخی نہیں بکھیرتا بلکہ ہمدردی اور فہم کا پیغام دیتا ہے۔ ان کی تحریروں میں بیدر کی تہذیبی فضا، گھریلو زندگی کی نزاکتیں، رشتوں کی پیچیدگیاں اور معاشرتی دباؤ پوری شدت کے ساتھ محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات کو افسانوی پیرائے میں اس طرح ڈھالتی ہیں کہ وہ بڑے سماجی مسائل کی علامت بن جاتے ہیں۔ یہی خوبی انہیں محض کہانی نویس نہیں بلکہ سماج کی نبض شناس قلمکار ثابت کرتی ہے۔ رخسانہ نازنین کی

زبان میں نہ تصنع ہے اور نہ غیر ضروری ثقالت۔ ان کا اسلوب سادہ ہونے کے باوجود فکری اعتبار سے گہرا ہے۔ وہ مکالموں کے ذریعے کرداروں کی نفسیات کو اس طرح اجاگر کرتی ہیں کہ قاری خود کو ان کے قریب محسوس کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں مکالمہ محض گفتگو نہیں بلکہ کردار کی داخلی کیفیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ رخسانہ نازنین کا ادب دراصل بیدر کی ادبی روایت کا تسلسل ہے۔ وہ اس روایت کو محض سنبھالتی نہیں بلکہ اسے نئے عہد کے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھاتی ہیں۔ ان کا قلم ماضی کی تہذیب سے جڑا ہوا ہے مگر حال کے مسائل سے پوری طرح باخبر بھی۔ یہی امتزاج ان کے فن کو عصری معنویت عطا کرتا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ملنے والے اعزازات اور انعامات محض رسمی توثیق نہیں بلکہ ان کے مسلسل ادبی سفر کی عملی شہادت ہیں۔ مگر ان کی اصل پہچان ان کے افسانے ہیں، جو رسائل و جرائد کے صفحات سے نکل کر قاری کے دل و دماغ میں جگہ بناتے ہیں۔ رخسانہ نازنین کی تحریریں ہمیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ ادب محض تفریح نہیں بلکہ ذمہ داری بھی ہے۔ ان کا قلم ہمیں زندگی کے ان پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے جن پر عموماً پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ سماج کو آئینہ دکھاتی ہیں، مگر اس آئینے میں نفرت نہیں، اصلاح کی امید جھلکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رخسانہ نازنین کو محض بیدر کی نہیں بلکہ جنوبی ہند کی اردو افسانہ نگاری میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کا فن آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بن سکتا ہے، اور ان کی تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ خلوص، محنت اور فکری دیانت کے ساتھ کیا گیا ادبی کام کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔

رخسانہ نازنین کے افسانوی ادب کا سب سے قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعے محض کہانیاں نہیں سناتیں بلکہ سماج کے لاشعور میں پیوست ان سوالات کو سطح پر لے آتی ہیں جن سے اکثر نظریں چرا لی جاتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کا کرب، عورت کا داخلی اضطراب، رشتوں کی پیچیدگیاں اور معاشی دباؤ اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ قاری کے لیے ان سے الگ ہو کر پڑھنا ممکن نہیں رہتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں افسانہ محض تخلیق نہیں رہتا بلکہ تجربہ بن جاتا ہے۔

رخسانہ نازنین نے افسانہ نگاری کو نسوانی جذبات کے یک رخی اظہار تک محدود نہیں رکھا۔ ان کے یہاں عورت کے مسائل سماج کے مجموعی مسائل کے تناظر میں سامنے آتے ہیں۔ وہ یہ باور کراتی ہیں کہ عورت کا دکھ محض عورت کا نہیں بلکہ پورے سماجی ڈھانچے کا دکھ ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں عورت کی مظلومیت کے ساتھ ساتھ اس کی قوتِ برداشت، صبر، فہم اور بعض اوقات خاموش مزاحمت بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی عورت روتی ضرور ہے مگر بے معنی آنسو نہیں بہاتی؛ وہ سہتی ضرور ہے مگر احساسِ ذمہ داری کے ساتھ۔ رخسانہ نازنین کے افسانوں میں مرد کردار بھی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ وہ مرد کو یکسر ظالم یا جابر بنا کر پیش نہیں کرتیں بلکہ اسے حالات کے دباؤ، معاشی مجبوریوں اور سماجی توقعات کے درمیان پسا ہوا انسان دکھاتی ہیں۔ افسانہ ”واپسی“ میں شکیل احمد کی خاموش اذیت، اس کی عزتِ نفس کی ٹوٹ پھوٹ اور قربانی کی مجبوری دراصل اس مرد اساس معاشرے کی ایک المناک تصویر ہے جہاں مرد سے مسلسل توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہر حال میں مضبوط رہے، چاہے اندر ہی اندر بکھر کیوں نہ رہا ہو۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو رخسانہ نازنین کا فن محض نسوانی نہیں بلکہ انسانی ادب کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کے افسانوں کی فضا میں ایک عجیب سی سنجیدگی اور ٹھہراؤ ہے۔ وہ تیز رفتار واقعات، چونکا دینے والے موڑ یا غیر متوقع انجام کے ذریعے قاری کو متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ ان کے ہاں زندگی

آہستہ آہستہ اپنے راز کھولتی ہے، اور یہی آہستگی قاری کو سوچنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ان کے افسانوں کے اختتام اکثر کھلے ہوتے ہیں، جہاں کہانی ختم ہو جاتی ہے مگر سوال باقی رہ جاتے ہیں۔ یہی سوالات دراصل ان کے فن کی اصل کامیابی ہیں۔ رخسانہ نازنین کی نثر میں ایک خاص طرح کی شفافیت پائی جاتی ہے۔ وہ نہ تو لسانی تجربات کے نام پر قاری کو الجھاتی ہیں اور نہ ہی غیر ضروری علامتوں اور استعاروں کا سہارا لیتی ہیں۔ ان کی تحریر میں لفظ اپنے اصل مفہوم کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں اور جملے اپنے وزن اور تاثیر کے ساتھ قاری کے ذہن میں اترتے ہیں۔ یہی سادگی ان کے اسلوب کو عام فہم بناتی ہے، اور یہی فہم ان کے ادب کو وسیع حلقۂ قارئین تک پہنچاتی ہے۔

رخسانہ نازنین کی ایک اہم خصوصیت ان کا مشاہدہ ہے۔ وہ سماج کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو نظر انداز نہیں کرتیں بلکہ انہیں بڑے فکری تناظر میں پیش کرتی ہیں۔ ایک گھر کا منظر، ایک عورت کی خاموشی، ایک مرد کی تھکی ہوئی آنکھیں، ایک بچے کی ضد—یہ سب ان کے افسانوں میں علامت بن جاتے ہیں۔ ان علامتوں کے ذریعے وہ قاری کو یہ احساس دلاتی ہیں کہ زندگی کے بڑے المیے اکثر چھوٹے واقعات میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری میں اصلاحی پہلو نمایاں ضرور ہے، مگر وہ کسی بھی مقام پر ادب کو محض اصلاحی پمفلٹ میں تبدیل نہیں ہونے دیتیں۔ ان کا فن ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ادب کا اصل کام سماج کو آئینہ دکھانا ہے، نہ کہ اسے زبردستی بدلنے کا دعویٰ کرنا۔ وہ قاری کو خود نتیجہ اخذ کرنے کی آزادی دیتی ہیں، اور یہی آزادی ادب کی اصل طاقت ہوتی ہے۔

رخسانہ نازنین کے مضامین کا مجموعہ "دستک" بھی ان کے فکری شعور کا آئینہ دار ہے۔ ان مضامین میں بھی وہی سنجیدگی، وہی دردمندی اور وہی سماجی شعور نظر آتا ہے جو ان کے افسانوں کی پہچان ہے۔ ان کے مضامین محض موضوعاتی تحریریں نہیں بلکہ ایک حساس ذہن کی فکری دستاویز ہیں، جو قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ ادبی تنظیموں اور اداروں سے ان کی وابستگی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ محض تخلیق کار نہیں بلکہ ادب کی ترویج و اشاعت میں بھی سرگرم کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ بزمِ غزالاں، یارانِ ادب اور دیگر ادبی پلیٹ فارمز کے ذریعے انہوں نے خواتین قلمکاروں کو حوصلہ دیا اور اردو ادب کے فروغ میں عملی حصہ لیا۔ یہ پہلو ان کی شخصیت کو مزید باوقار اور معتبر بناتا ہے۔ رخسانہ نازنین کی ادبی خدمات پر ہونے والا تحقیقی کام، خصوصاً گلبرگہ یونیورسٹی میں ان کی شخصیت اور فن پر لکھا گیا مقالہ، اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا فن محض وقتی مقبولیت تک محدود نہیں بلکہ علمی و تحقیقی سطح پر بھی توجہ کا مرکز بن چکا ہے۔ کسی قلمکار کے لیے یہ ایک بڑا اعزاز ہوتا ہے کہ اس کی تخلیقات تعلیمی اور تحقیقی حلقوں میں زیرِ مطالعہ آئیں۔ ان کے افسانوں میں بیدر کی تہذیبی روح، گھریلو زندگی کی سچائیاں اور جنوبی ہند کی سماجی فضا پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ مقامی رنگ کو اس مہارت سے پیش کرتی ہیں کہ وہ آفاقی معنویت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے بیدر تک محدود نہیں رہتے بلکہ ہر اس قاری سے مکالمہ کرتے ہیں جو انسانی رشتوں اور سماجی حقیقتوں سے دلچسپی رکھتا ہے۔ رخسانہ نازنین کے فن کا سب سے بڑا وصف شاید یہی ہے کہ وہ قاری کے دل میں ہمدردی اور سوچ کی ایک نئی لہر پیدا کرتی ہیں۔ ان کا ادب نفرت نہیں پھیلاتا، بلکہ سمجھ بوجھ، صبر اور توازن کا پیغام دیتا ہے۔ وہ ہمیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ سماج کی اصلاح چیخ و پکار سے نہیں بلکہ فہم اور شعور سے ممکن ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ رخسانہ نازنین اردو افسانے کی اس روایت کی امین ہیں جس میں ادب زندگی سے کٹا

ہوا نہیں بلکہ زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ ان کا قلم نہ صرف بیدر کی ادبی روایت کو روشن رکھے ہوئے ہے بلکہ اردو ادب کے وسیع تر افق پر بھی اپنی روشنی بکھیر رہا ہے۔ ان کی تحریریں آج بھی پڑھنے والے کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں اور آنے والے وقت میں بھی اپنی معنویت برقرار رکھیں گی۔

رخسانہ نازنین کا فن اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ سچی تخلیق کبھی شور کی محتاج نہیں ہوتی۔ خاموشی، سادگی اور سچائی اگر قلم میں سما جائیں تو ادب خود اپنی پہچان بنا لیتا ہے۔ بیدر کی اس درخشاں بیٹی نے اپنے فن سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عورت کا قلم اگر شعور، دیانت اور دردمندی سے لکھے تو وہ نہ صرف اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے فکری سرمایہ بھی بن جاتا ہے۔ رخسانہ نازنین کے فن کی معنویت کو اگر اس کے مجموعی تاثر کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت پوری شدت سے سامنے آتی ہے کہ وہ اردو افسانے کو محض جذباتی سطح پر نہیں برتتیں بلکہ اسے فکری، تہذیبی اور اخلاقی جہت عطا کرتی ہیں۔ ان کا افسانہ قاری کو وقتی مسرت یا آنسو کی سطح پر نہیں چھوڑتا بلکہ اسے اپنے ضمیر کے آئینے میں جھانکنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی وصف انہیں محض ایک کامیاب افسانہ نگار نہیں بلکہ ایک صاحبِ بصیرت ادیبہ کے مرتبے پر فائز کرتا ہے۔

رخسانہ نازنین کے یہاں کہانی کا مرکزی محور اکثر وہ خاموش انسان ہوتا ہے جو سماج کی بھیڑ میں گم ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں شور نہیں، احتجاج نہیں، نعرہ نہیں—بلکہ ایک ایسی خاموش چیخ ہے جو قاری کے دل و دماغ میں دیر تک گونجتی رہتی ہے۔ وہ زندگی کے ان پہلوؤں کو موضوع بناتی ہیں جن پر عام طور پر بات نہیں کی جاتی، یا اگر کی جاتی ہے تو سطحی انداز میں۔ وہ دکھاتی ہیں کہ انسان کا اصل المیہ خارجی نہیں بلکہ داخلی ہوتا ہے، اور یہی داخلی کرب ان کے افسانوں کی روح ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں کا مطالعہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ کردار سازی میں غیر معمولی مہارت رکھتی ہیں۔ ان کے کردار نہ تو محض علامت ہوتے ہیں اور نہ ہی بے جان خاکے؛ وہ جیتے جاگتے انسان ہوتے ہیں جن کے جذبات، کمزوریاں، خواہشیں اور خوف سب ہمارے اپنے جیسے محسوس ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ قاری ان کرداروں کو پڑھتے ہوئے انہیں پہچان لیتا ہے— کبھی وہ خود کو ان میں دیکھتا ہے، کبھی اپنے اردگرد کے لوگوں کو۔

رخسانہ نازنین کی افسانہ نگاری میں عورت کا وجود ایک اہم مگر متوازن حیثیت رکھتا ہے۔ وہ عورت کو مظلوم دکھاتے ہوئے بھی اس کی عظمت، وقار اور اندرونی قوت کو نظر انداز نہیں کرتیں۔ ان کے افسانوں کی عورت حالات کے ہاتھوں مجبور ضرور ہے، مگر مکمل طور پر بے بس نہیں۔ وہ خاموش رہ کر بھی بہت کچھ کہہ جاتی ہے، اور یہی خاموشی ان کے فن کا سب سے مؤثر ہتھیار بن جاتی ہے۔ اس خاموشی میں احتجاج بھی ہے، سوال بھی اور امید بھی۔ ان کے یہاں امید کی کرن بہت مدھم سہی، مگر بجھتی نہیں۔ ان کے افسانے قاری کو مایوسی کے اندھیرے میں چھوڑ کر نہیں جاتے بلکہ یہ احساس دلاتے ہیں کہ زندگی کی تمام تر تلخیوں کے باوجود انسان کے اندر بہت کچھ باقی رہتا ہے محبت، ہمدردی، برداشت اور بہتر کل کی خواہش۔ یہی انسانی قدریں ان کے ادب کو دیرپا بناتی ہیں۔ رخسانہ نازنین کے اسلوب میں ایک طرح کی تہذیبی شائستگی نمایاں ہے۔ ان کی زبان میں کہیں بھی ابتذال، تلخی یا غیر ضروری سختی نظر نہیں آتی۔ وہ تلخ حقیقتوں کو بھی اس مہذب انداز میں بیان کرتی ہیں کہ قاری ان سے بدکنے کے بجائے انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اسلوب دراصل ان کی شخصیت کے تہذیبی شعور کی عکاسی کرتا ہے، جو بیدر کی علمی و ادبی روایت سے جڑا ہوا ہے۔

بیدر کی سرزمین جس نے صدیوں تک علم، تصوف اور ادب کو اپنے دامن میں سمیٹے رکھا، رخسانہ نازنین کے فن میں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کا افسانوی سفر کا آغاز اپریل 1992 سے ہوا اور تا حال پر زور قلم آج بھی جاری ہے۔

ان کے افسانوں میں بیدر صرف ایک شہر نہیں بلکہ ایک تہذیبی علامت بن کر سامنے آتا ہے ایسا شہر جہاں روایت اور جدیدیت ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نہیں بلکہ مکالمے میں مصروف ہیں۔ یہی مکالمہ ان کے ادب کو عصری معنویت عطا کرتا ہے۔ رخسانہ نازنین کے افسانوں میں گھریلو زندگی کی عکاسی خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ وہ باور کراتی ہیں کہ گھر محض چار دیواری کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل سماج ہوتا ہے، جہاں محبت بھی جنم لیتی ہے اور نفرت بھی، جہاں قربانی بھی ہوتی ہے اور ناانصافی بھی۔ ان کے افسانے اس گھریلو سماج کے ان پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں جو اکثر پردۂ خفا میں رہ جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مذہبی، سماجی یا ثقافتی تعصب کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھتی ہیں، اور یہی انسان دوستی ان کے ادب کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ ان کے افسانوں میں اخلاقیات کسی وعظ کی صورت میں نہیں آتیں بلکہ زندگی کے فطری بہاؤ کے ساتھ قاری کے دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔

رخسانہ نازنین کا شمار ان قلمکاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے شہرت کی دوڑ کے بجائے تخلیقی سچائی کو ترجیح دی۔ انہوں نے نہ تو وقتی ادبی رجحانات کی پیروی کی اور نہ ہی آسان راستہ اختیار کیا۔ ان کا فن اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ سچی تخلیق وقت لیتی ہے، صبر مانگتی ہے اور دیانت چاہتی ہے۔ یہی دیانت ان کے ہر افسانے میں جھلکتی ہے۔ ان کے افسانوی ادب کا ایک اور اہم پہلو اس کا تدریجی اثر ہے۔ ان کی کہانیاں پہلی قرأت میں شاید مکمل طور پر اپنی معنویت ظاہر نہ کریں، مگر وقت گزرنے کے ساتھ وہ قاری کے ذہن میں گہرائی اختیار کرتی چلی جاتی ہیں۔ یہ وہ ادب ہے جسے بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے، اور ہر بار ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔

رخسانہ نازنین کی ادبی خدمات کا اعتراف جس طرح ادبی حلقوں، تنظیموں اور تحقیقی اداروں نے کیا ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا فن محض مقامی سطح تک محدود نہیں رہا۔ ان کا نام آج اردو افسانے کی سنجیدہ روایت میں احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے، اور یہ احترام کسی وقتی تاثر کا نتیجہ نہیں بلکہ برسوں کی خاموش، مسلسل اور خلوص بھری تخلیقی کاوش کا ثمر ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ رخسانہ نازنین اردو افسانے کی اس روشن روایت کی نمائندہ ہیں جو انسان کو اس کے اصل مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ ان کا ادب ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ سماج کی ساری پیچیدگیوں کے باوجود انسان کی اصل پہچان اس کا اخلاق، اس کا درد اور اس کی انسانیت ہے۔ ان کا قلم اسی انسانیت کی پاسبانی کرتا نظر آتا ہے۔ آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیدر کی حنائی سرزمین نے جس طرح ماضی میں بڑے اہلِ علم و ادب کو جنم دیا، رخسانہ نازنین اسی روایت کی زندہ مثال ہیں۔ ان کا فن نہ صرف بیدر کی ادبی شناخت کو تقویت دیتا ہے بلکہ اردو ادب کے مجموعی سرمائے میں بھی ایک قیمتی اضافہ ہے۔ ان کی تحریریں آج بھی معنی خیز ہیں اور آنے والے کل میں بھی اپنی تازگی، سچائی اور تاثیر کے ساتھ زندہ رہیں گی۔ رخسانہ نازنین کا ادبی سفر اس حقیقت کا اعلان ہے کہ اگر قلم میں خلوص ہو، نظر میں گہرائی ہو اور دل میں انسان دوستی ہو تو ادب محض لفظوں کا کھیل نہیں رہتا بلکہ ایک زندہ روایت بن جاتا ہے۔ ایسی روایت جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے اور وقت کے ساتھ مزید نکھرتی چلی جاتی ہے۔

کتاب
در
کتاب

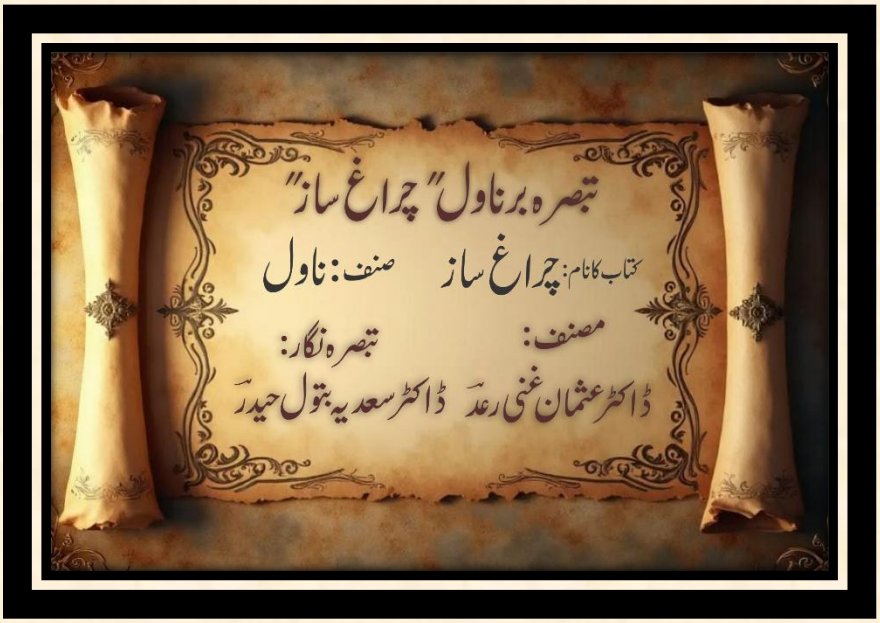

مصنف کا تعارف

عثمان غنی رعدؔ ۲۵ فروری ۱۹۹۰ کو صوبہ پنجاب کے شہر حافظ آباد میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک کی تعلیم حافظ آباد ہی میں حاصل کی۔ اس کے بعد منڈی بہاؤالدین سے تین سالہ جی سی ٹی رسول منڈی بہاؤالدین سے تین سالہ انجینیرنگ ڈپلومہ حاصل کیا۔ اس کے بعد چار سالہ بی ٹیک آنرز (انجینیرنگ) کی ڈگری حاصل کی۔ پھر پنجاب یونیورسٹی سے بی-اے اور ایم-اے اردو کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد نمل اسلام آباد سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اب بطور لیکچرار شعبہ اردو نمل اسلام آباد سے وابستہ ہیں۔

عثمان غنی رعدؔ اردو ادب کے ایک نمایاں افسانہ نگار ہیں جنہوں نے معاصر زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو نہایت فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں ایک گہرا مشاہدہ، فکری گہرائی اور جمالیاتی توازن دکھائی دیتا ہے۔" کنتستان "جیسا افسانوی مجموعہ ہو یا" چراغ ساز "جیسی علامتی کہانی— ان کا قلم سماجی ناہمواری، مذہبی استحصال، طبقاتی کشمکش اور انسانی جذبات کی نفسیاتی گرہیں کھولنے میں مہارت رکھتا ہے۔

عثمان غنی رعدؔ کی نثر میں ایک مخصوص استعاراتی فضا پائی جاتی ہے، جو ان کے اسلوب کو نہ صرف فکری بلکہ علامتی و تخلیقی بھی بناتی ہے۔ وہ کہانی کے کرداروں کو محض ایک قصے کے حصے کے طور پر نہیں بلکہ پورے عہد کی علامتوں کے طور پر تراشتے ہیں۔ ان کا انداز بیان سادہ مگر مؤثر ہے، جو قاری کے ذہن و دل پر دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔

تبصرہ:

عثمان غنی رعد کا ناول" چراغ ساز "اردو فکشن میں ایک منفرد اضافہ ہے، جو نہ صرف روایتی اور جدید زندگی کے تصادم کو بیان کرتا ہے بلکہ انسانی جذبات، روایت، جدت، اور سماجی ارتقا کے پیچیدہ رشتوں کو بھی کھولتا ہے۔ یہ کہانی ایک کمہار کی ہے جو نسل در نسل چراغ بنانے کا ہنر اپنائے ہوئے

ہے۔ چراغ، جو روشنی کا استعارہ ہے، اس ناول میں زندگی، روایت اور قربانی کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مگر بدلتے وقت کے ساتھ جب برقی روشنی نے چراغ کی جگہ لے لی، تو یہ نہ صرف مٹی کے چراغوں کا زوال تھا بلکہ ایک پوری تہذیب کی معنویت اور جذباتی وابستگی بھی ختم ہونے لگی۔

ناول کا مرکزی کردار چراغی اپنے ہنر کی بقا کے لیے مختلف راستے تلاش کرتا ہے۔ وہ اپنی شناخت کو بچانے کی کوشش میں نہ صرف گاؤں کے بڑوں اور مذہبی شخصیات سے رجوع کرتا ہے بلکہ جدیدیت کے سیلاب کے سامنے ایک مضبوط دیوار بن کر کھڑا رہتا ہے۔ اس کا یہی سفر قاری کو اس کہانی میں باندھ کر رکھتا ہے۔

ناول میں سب سے زیادہ متاثر کن پہلو اس کا فلسفیانہ انداز ہے۔" چراغ "صرف ایک مادی شے نہیں بلکہ ایک نظریہ ہے، جو خود جل کر دوسروں کو روشنی دینے کا درس دیتا ہے۔ مگر جب بجلی کی تیز روشنی آتی ہے، تو نہ صرف چراغ بلکہ اس کے ساتھ جڑی وہ تمام وابستگیاں، احساسات، اور ایک خاص طرز زندگی بھی مدھم پڑنے لگتی ہیں۔

ناول کا ایک اور طاقتور پہلو کردار نگاری ہے۔" چراغی "، اس کی بیوی، گاؤں کے بزرگ، نوجوان نسل، اور روایتی پنچایت جیسے کردار نہایت حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ خاص طور پر چراغی اور نوجوان نسل کا مکالمہ اس ناول کا مرکزی نکتہ ہے، جو روایتی و جدید طرز فکر کے درمیان جھولتی دنیا کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔

یہ ناول ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ جدت کو روکا نہیں جا سکتا، کیونکہ یہ سورج کی روشنی کی طرح آتی ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ روایت کو فراموش کر دیا جائے۔ روایت کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے وقت کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے، تاکہ نہ وہ ماضی کا بوجھ بنے اور نہ ہی جدیدیت اس کی شناخت مٹا سکے۔

مجموعی طور پر،" چراغ ساز "نہایت عمدہ اور بصیرت افروز ناول ہے جو قاری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ روایت اور جدیدیت کے درمیان تعلق کو ایک نئی نظر سے دیکھے۔ یہ ایک ایسی تحریر ہے جو قاری کو آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھتی ہے اور ایک گہرا فکری تاثر چھوڑتی ہے۔

کردار:

ناول" چراغ ساز "کے کردار گہرائی اور معنویت کے حامل ہیں، جو صرف کہانی کو آگے نہیں بڑھاتے بلکہ ناول کے بنیادی موضوعات کو بھی واضح کرتے ہیں۔ ہر کردار اپنی جگہ ایک علامت ہے، جو روایت، جدیدیت، قربانی اور تہذیبی تبدیلیوں کی مختلف جہتوں کو اجاگر کرتا ہے۔

۱ - چراغی (مرکزی کردار، روایت کا محافظ) - چراغی ایک کمہار ہے جو نسل در نسل چراغ بنانے کے ہنر سے جڑا ہوا ہے۔ وہ ناول میں روایت کا استعارہ ہے، جو اپنے آباواجداد کے فن کو بچانے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ وہ جدیدیت کے سیلاب کو دیکھ کر خوفزدہ بھی ہوتا ہے، مگر اپنی محنت اور لگن سے چراغ سازی کی روایت کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی شخصیت استقامت، لگن اور اپنی جڑوں سے وابستگی کی مثال ہے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سمجھنے لگتا ہے کہ روایت کو مستقبل کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہے، نہ کہ اسے جامد رکھنا۔

۲-نوجوان (جدید نسل کا نمائندہ(

یہ کردار نوجوان نسل کا عکاس ہے، جس کا نام ناول میں کہیں بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ ایک ابہام ہے، جو شاید اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ کوئی ایک فرد نہیں بلکہ پوری نئی نسل کی نمائندگی کر رہا ہے۔ جوان ترقی، تبدیلی اور جدت کا حامی ہے، وہ چراغی سے سوال کرتا ہے، دلائل دیتا ہے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ دنیا آگے بڑھ رہی ہے اور روایت کو بھی وقت کے ساتھ چلنا ہوگا۔ مگر وہ چراغی کے ہنر اور قربانی کی عظمت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔

۳ - چراغی کی بیوی (محبت اور صبر کی علامت)

چراغی کی بیوی کا کردار روایتی عورت کے صبر اور قربانی کو پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے جذبات کو سمجھتی ہے، اس کے دکھ اور ناکامیوں میں اس کا ساتھ دیتی ہے، مگر وہ بھی یہ جانتی ہے کہ دنیا بدل رہی ہے اور اسے بھی اس تبدیلی کو قبول کرنا ہوگا۔

۴ - گاؤں کے بزرگ (پرانی نسل کی دانش)

یہ کردار ماضی کی روایات اور دانش کے امین ہیں۔ وہ چراغی کی پریشانیوں کو سمجھتے ہیں، مگر کچھ حد تک جدیدیت کے سامنے بے بس بھی محسوس کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ روایت بچ جائے، مگر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ نئی دنیا کے تقاضے مختلف ہیں۔

۵ - گاؤں کے چوہدری) طاقت اور اختیار کی علامت(

چوہدری کا کردار گاؤں کے اس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو طاقت، اختیار اور فیصلوں کا مرکز ہے۔ وہ نئے اور پرانے کے بیچ ایک پل کی مانند ہے۔ وہ روایت کو مکمل ختم کرنے کے حق میں نہیں، مگر جدیدیت کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کرتا۔

۶-پنچایت (اجتماعی فیصلوں کی جگہ)

یہ کردار کسی ایک فرد کی بجائے گاؤں کے اجتماعی شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہاں سماجی اور تہذیبی سوالات پر بحث ہوتی ہے، فیصلے کیے جاتے ہیں، اور پرانے و نئے خیالات کے درمیان ایک جنگ دیکھی جا سکتی ہے۔

۷- چرچ کے فادر اور مسجد کے مولوی (مذہبی سوچ کے نمائندے)

چراغی جب اپنی روایت کے تحفظ کے لیے چرچ کے فادر اور مسجد کے مولوی سے مدد مانگتا ہے، تو یہ دونوں کردار مذہب اور ثقافت کی مشترکہ بنیادوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ مگر وہ بھی جدیدیت کے بڑھتے اثرات کو روکنے میں خود کو کمزور محسوس کرتے ہیں۔

۸ - اندھے بزرگ میاں بیوی (ایک علامتی اور فکری جہت)

اندھے بزرگ میاں بیوی بظاہر تو ایک عام، گمنام جوڑا ہے، مگر ان کی گفتگو، کردار، اور چراغی کے ساتھ تعلق ایک علامتی اور فکری جہت رکھتا ہے۔ بصارت سے محروم، بصیرت سے روشن: یہ دونوں کردار جسمانی طور پر اندھے ہیں، مگر ان میں ایک ایسی روحانی بصیرت ہے جو چراغی کو اس کی زندگی، روایت، اور خواب کی معنویت سے روشناس کراتی ہے۔ یہ کردار گویا" چراغی "کے اندر جھانکتے ہیں، اسے سچ دکھاتے ہیں جو وہ خود نہیں دیکھ پاتا۔

روایت اور سوال: ان کی گفتگو چراغی کو اپنے خاندانی پیشے، سماجی ڈھانچے، اور مذہبی و ثقافتی تعصبات پر سوال اٹھانے کی ترغیب دیتی ہے۔ ان کی زبان میں سادگی ہے، مگر معانی میں فلسفہ چھپا ہوتا ہے۔

صدیوں کا تجربہ: یہ کردار صدیوں پرانی روایت، خاموش اذیت، اور تہذیبی نرمی کا استعارہ ہیں۔ وہ نہ صرف خود چراغی سے بات کرتے ہیں بلکہ قاری سے بھی گویا ہوتے ہیں کہ:

"جو دیکھتے ہو وہی سچ نہیں، جو نہیں دیکھ سکتے وہی سب سے گہرا سچ ہے۔ "-سعدی

ناصحانہ مگر خاموش فلاسفی: یہ جوڑا کسی واعظ کی طرح نہیں، بلکہ زندگی کی ٹھوکر کھائے ہوئے درویشوں کی طرح بات کرتا ہے۔ چراغی کی الجھنوں کے جواب دیتے ہیں، مگر قاری کو بھی سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

اندھے بزرگ میاں بیوی کا کردار ناول کا ایک روحانی اور فکری ستون ہے، جو نہ صرف چراغی کو روشنی دکھاتے ہیں بلکہ قاری کو بھی علم، روایت اور سوال کے درمیان جھولتی انسانی شناخت کا سامنا کرواتے ہیں۔ ان کو تجزیہ سے خارج کرنا ناول کی معنویت کو کم کرنا ہو گا۔

۹- چراغی کی بیٹی (نئی نسل کی حقیقت(

ناول کی علامتی روح۔ وہ بچی جو چراغی کی آخری امید ہے، جسے وہ مرنے سے پہلے نوجوان کی گود میں دیتا ہے۔ وہی بچی تعلیم حاصل کر کے یونیورسٹی کی لیکچرار بنتی ہے اور گو بظاہر چراغ سازی کا ہنر ختم ہو جاتا ہے، مگر اس کی روحانی روشنی اس بیٹی کے کردار سے آگے بڑھتی ہے۔

"چراغ ساز " کے کردار دراصل تہذیبی تبدیلی کے مختلف زاویے پیش کرتے ہیں۔ چراغی ماضی کی وابستگی کا استعارہ ہے، جوان مستقبل کے امکانات کا نمائندہ ہے، چراغی کی بیوی قربانی کی علامت ہے، اور گاؤں کے دوسرے کردار سماجی ارتقا کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہی کردار ناول کو محض ایک کہانی نہیں، بلکہ ایک فکری تجربہ بنا دیتے ہیں، جہاں قاری خود کو روایت اور جدیدیت کی کشمکش میں شامل محسوس کرتا ہے۔

ناول" چراغ ساز "کا موضوع، اسلوب اور تکنیکس

موضوع:

ناول" چراغ ساز "ایک گہرے تہذیبی اور فکری موضوع کو اٹھاتا ہے، جو روایت اور جدیدیت کے تصادم پر مبنی ہے۔ یہ کہانی صرف چراغ بنانے والے کمہار کی نہیں، بلکہ ایک پورے معاشرتی نظام کے بدلنے کی کہانی ہے۔ ناول میں ثقافتی زوال، مشینی ترقی، روایت کی بقا، جدیدیت کی ناگزیر حقیقت، دیہی زندگی کی مشکلات، انسانی جدوجہد اور وقت کے ساتھ چلنے کی ضرورت جیسے اہم موضوعات کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ ناول سوال اٹھاتا ہے کہ:

کیا روایت کو بچایا جا سکتا ہے؟

کیا جدیدیت ہی واحد راستہ ہے ؟

کیا ماضی اور مستقبل میں کوئی ہم آہنگی ممکن ہے ؟

یہی سوالات ناول کو ایک فکری جہت دیتے ہیں، جس میں قاری بھی اپنے تجربات کی روشنی میں اپنا جواب تلاش کرتا ہے۔

اسلوب:

ناول کا اسلوب سادہ، رواں اور علامتی ہے۔ مصنف نے زبان میں غیر ضروری پیچیدگی پیدا نہیں کی، بلکہ روزمرہ کی عام زبان استعمال کی ہے تاکہ قاری کرداروں کے جذبات کو محسوس کر سکے۔ بیانیہ اسلوب ناول میں غالب ہے، لیکن مکالمے بھی نہایت فطری اور جاندار ہیں۔ علامتوں کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے، مثلاً چراغ روایت کی علامت ہے، جبکہ بجلی اور مشینیں جدیدیت کی علامت کے طور پر آتی ہیں۔ منظر نگاری بہت عمدہ ہے، جو کہانی کے ماحول کو حقیقی بنا دیتی ہے۔ خاص طور پر چراغی کی بھٹی، اس کا کام، گاؤں کے مناظر اور بدلتے وقت کے اثرات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ کرداروں کی نفسیاتی گہرائی کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، جو ان کی سوچ اور رویوں میں واضح نظر آتی ہے۔

تکنیکس:

مصنف نے اس ناول میں پنجابی الفاظ کا استعمال کر کے جہاں پنجابی روایت کو جدید روایت سے جوڑا ہے وہیں جدید اور کلاسیکی تکنیکوں کا امتزاج کر کے جدت کو روایت سے روشناس بھی کرایا ہے۔

واقعات کی منطقی ترتیب: کہانی میں واقعات وقت کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، کہیں کہیں فلیش بیک کی تکنیک موجود ہے، خصوصاً چراغی کے کردار میں۔ وہ ماضی میں اپنے والد کے خیالات اور مکالموں میں ڈوبتا ہے، جو نہ صرف اس کے کردار کی تشکیل کرتے ہیں بلکہ ناول کی تھیم، روایت، اور تسلسل کے ساتھ جُڑے ہوتے ہیں۔ یہ فلیش بیک نہ صرف بیانیہ میں گہرائی پیدا کرتے ہیں بلکہ چراغ سازی کی روایت کے تسلسل کو علامتی طور پر واضح کرتے ہیں۔

تمثیلی انداز: چراغ بنانے کا فن صرف ہنر نہیں بلکہ ثقافت، روایت اور ورثے کی علامت ہے، جبکہ نئی روشنی اور مشینیں ترقی اور میکانیکی زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں۔

کرداروں میں علامتی رنگ: چراغی روایت کا استعارہ ہے جبکہ نوجوان نئی نسل اور ترقی پسندی کا عکاس ہے۔ چراغی کی بیوی قربانی اور صبر کی علامت ہے۔

گاؤں کا منظر نامہ اور دیہی حقیقت پسندی: مصنف نے تکنیکی طور پر ناول میں دیہی زندگی کے حقیقی رنگ بھرے ہیں، جو ایک خاص سوشیولوجیکل اینگل پیش کرتے ہیں۔

تہذیبی مکالمہ: ناول میں مکالمے صرف کرداروں کے درمیان بات چیت نہیں، بلکہ ایک فکری مباحثہ ہیں جو ماضی اور حال کے تصادم کو واضح کرتے ہیں۔

"چراغ ساز " محض ایک کہانی نہیں بلکہ وقت کے ساتھ بدلتی ہوئی انسانی تہذیب کا نوحہ ہے۔ اس میں روایت کی شکست، جدیدیت کی جیت اور سماجی تبدیلیوں کے اثرات کو انتہائی فنی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے سادہ مگر گہرا ہے، جس میں قاری کو سوچنے پر مجبور

کر دینے کی طاقت موجود ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ چراغ ساز ایک ایسا بیانیہ ہے جو قاری کو خاموشی سے جھنجھوڑ دیتا ہے۔ یہ ناول ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہر نسل کو اپنے چراغ خود جلانے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات چراغ بجھ جاتے ہیں، مگر ان کی راکھ سے بھی نئی روشنی پیدا کی جا سکتی ہے۔

چراغی مر جاتا ہے، مگر اس کی بیٹی — جسے وہ "چراغ سازی" کی ایک اور شکل میں چھوڑ کر جاتا ہے — ثابت کرتی ہے کہ:

"روایت مٹی میں دفن نہیں ہوتی، وہ تربیت اور شعور کے ذریعے نئے روپ میں پھولتی ہے۔) "سعدی(

"چراغ ساز "نہ صرف ایک علامتی عنوان ہے بلکہ اس کا ہر کردار ایک نیا مفہوم روشن کرتا ہے۔ اسی مفہوم کو میں نے ایک نثری نظم میں یوں محسوس کیا ہے۔۔۔

چراغ سازی کے اور بھی طریقے ہیں۔۔۔!

کہیں ایک چراغی تھا

جو اپنی لو میں نسلوں کا خواب جلائے بیٹھا تھا

اسے یقین تھا،

ایک دن اسی لو سے کوئی بیٹا روشنی کا وارث بنے گا

کوئی ایسا ہاتھ

جو فتیلے کو محبت سے سلگانا جانتا ہو

مگر۔۔۔ چراغی کے خوابوں کو

اندھی روایتوں کی آنکھوں نے چاٹ لیا

اور وہ بیٹی، جو نرمی سے دنیا میں آئی

ماں کے آخری لمس سے لپٹی ہوئی

باپ کی آخری امید

چراغی مر گیا

کب، کہاں، کیسے، کیوں؟

یہ سوال نہیں۔۔۔ قصہ یہ ہے کہ

جو مر گئے وہ روشنی کا استعارہ چھوڑ گئے

اور جو جی رہے ہیں

وہ راکھ سے زندگی لکھ رہے ہیں
وہ بیٹی۔۔۔جو مٹی کے چراغ تو نہ بنا سکی
مگر وہ ایک نئی چراغ ساز بن گئی
وہ معلم بنی
جو مٹی کے انسان میں عقل و شعور کی لو
علم کے نور سے روشن کر کے
انسان کی شخصیت کو مثل چراغ کرتی ہے
چراغوں کی کہانیاں سنا کر
جن کی آنکھوں میں روشنی کم ہے
ان کے ذہنوں کو روشن کرتی ہے
کہاں لکھا ہے
کہ روشنی صرف جلنے میں ہے؟
کبھی کبھی
بجھ کر بھی چراغ
کسی کی زندگی کا سورج بن جاتا ہے۔۔۔!

ڈاکٹر سعدیہ بتول حیدرؔ

شاعری
سچ
بولتی
ہے

نعت

مقامِ مہر و محبت نبی ﷺ کا در ہے مجھے
نبی ﷺ کا نام جہاں بھر میں معتبر ہے مجھے

ہے فکر خام مری، لفظ ناتمام مرے
ثنا کے باب میں کافی یہ چشمِ تر ہے مجھے

رہے وجود میں حصہ نبی ﷺ کی چاہت کا
وہی سکون وہی جائے مستقر ہے مجھے

چہار سو مرے غلبہ ہو یاس و غم کا تبھی
نبی ﷺ کی بات دوا ہے علاجِ شر ہے مجھے

ورائے خاکِ مدینہ نہیں جہان میں کچھ
ہر ایک ذرہ جواہر ہے مال و زر ہے مجھے

قرینِ روضۂ اقدس درود پڑھتی رہوں
تمام زیست کا حاصل یہی ثمر ہے مجھے

قدم جہاں مرے آقا کے پڑ گئے تسنیم
وہ نقشِ پا مرا سب کچھ ہے راہبر ہے مجھے

تسنیم حسن

زیرِ نگاہِ خنجرِ قاتل نہیں ہوں میں
کیا خوب آج تیرے مقابل نہیں ہوں میں

تہذیبِ سنگ و خشت نے پہچان دی مجھے
لیکن مزاجِ شہر میں داخل نہیں ہوں میں

بدلہ، صلہ، عطا یہ سب اپنی جگہ درست
پر سود و زَر کے کھیل کا حاصل نہیں ہوں میں

ہر سمت سر فروشی کے فتوے ہیں آج کل
اس رسمِ سر بریدہ کا قائل نہیں ہوں میں

وہ زخم جو ضمیر نے کھا کر سجا لیے
ان کے عوض کسی کا بھی قاتل نہیں ہوں میں

ایمان کی ادا ہے شرر یا کہ سر کشی
دربارِ باطلاں کا توسائل نہیں ہوں میں

سرینگر۔۔۔ کشمیر

****

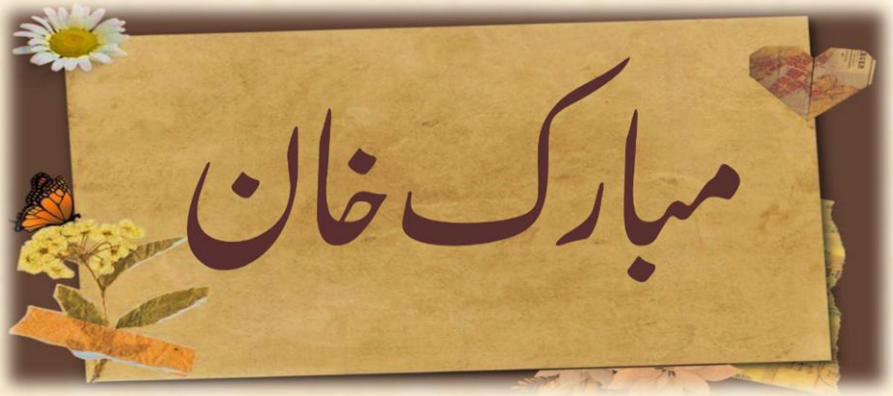

عشق سوچا ذہن میں سر آ گیا
پھر کہیں سے ایک پتھر آ گیا

وہ جو میری زندگی کا خواب تھا
خواب میں بھی خواب بن کر آ گیا

ورنہ کس کس در سے میں لوٹا نہ تھا
پھر خدایا آپ کا در آ گیا

جو گماں میں بھی نہ تھا میرے کبھی
وہ اچانک دل کے اندر آ گیا

میرے سینے کی خدایا خیر ہو
آج اس کے ہاتھ خنجر آ گیا

صحن میں جاتے ہوئے کچھ نقش پا
رات سپنے میں عجب گھر آ گیا

پھر سے کوئی معجزہ درکار ہے
راہ میں پھر سے سمندر آ گیا

آج لفظوں نے بھگوئے پھر ورق
آج اندر سے میں باہر آ گیا

ظاہر ہے وہ اثر، کہ جو ماں کی دعا میں ہے
دشمن کا میرے تیر، ابھی تک ہوا میں ہے

اب اس نے کچھ نہ کچھ تو چھپایا ردا میں ہے
تارا ہے آسماں کا، کہ آنسو قبا میں ہے

دیکھو تو اسکے رخ پہ یہ زلفوں کی اوڑھنی
اک ماہتاب ریشمی کالی گھٹا میں ہے

جی چاہتا ہے تجھ سے کروں عمر بھر سوال
اتنا مزہ اس ایک ترے لفظ "کیا" میں ہے

زنجیر روک پائی نہ دریا کبھی مجھے
کوئی نہ کوئی بات تو اسکی صدا میں ہے

منزل پہ آج تک نہیں پہنچا سکا مجھے
بس اک ذرا سا عیب مرے رہنما میں ہے

مجھ کو بجھا سکیں گی نہ یہ تیز آندھیاں
میں وہ چراغ ہوں کہ جو جلتا ہوا میں ہے

کیسے کہوں میں جان غزل اس کو اے * ادیب
دیوان میر جسکی فقط اک ادا میں ہے

****

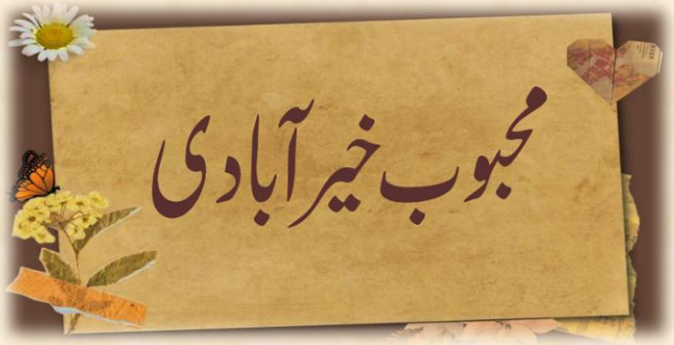

سچ کہنے کی عادت تھی سو کہتا ہی رہا میں
اس واسطے دنیا کی نظر میں ہوں برا میں

گردابِ مصائب میں ہوں مدّت سے گھرا میں
ایسے میں پکاروں کسے اک تیرے سوا میں

دل تیری محبت میں گرفتار ہوا جب
دنیا کی نگاہوں میں گنہگار ہُوا میں

اٹھّے گا کسی روز نقابِ رخِ باطل
توڑوں گا کبھی تیرا یہ پندارِ جفا میں

کیوں خونِ جگر آ گیا کاغذ پہ قلم سے
لکھنے کو جو بیٹھا کبھی تاریخِ وفا میں

گھیرے ہیں ہر اک سمت سے افلاس کے لشکر
کس طرح بچاؤں یہاں جاگیرِ انا میں

اے چشمِ فلک دیکھ مجھے بابِ وفا پر
مدّت سے تہی دست ہوں آشفتہ نوا میں

اے کاش کہ ہو کوچۂ جاناں دمِ آخر
اس ایک تمنا میں ہوں مائل بہ دعا میں

گو شہر تھا بیگانۂ دردِ دلِ انساں
دیتا رہا محبوب اُخوّت کی صدا میں

خیر آباد سیتاپور یوپی

****

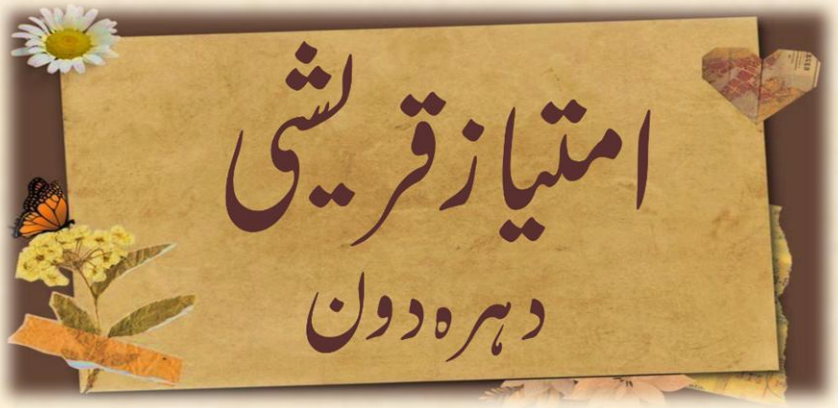

داستاں اپنی سناتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم تو بس عشق بہاتے ہوئے مر جاتے ہیں

خود سے ہی ملتے ہیں ہم اپنے بدن پر شولے
اور پھر آگ بجھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم سے اشتاق محبت کے سفر میں جانا
دھوپ کو چھاؤں بناتے ہوئے مر جاتے ہیں

جانے جاں تجھ کو پکاریں تو پکاریں کیسے
حرف آواز میں آتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم پہ الزام جفاؤں کا لگانے والے
ہم تیرے ناز اٹھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

زندگی دور بہت دور چلی جاتی ہے
ہم تو آواز لگاتے ہوئے مر جاتے ہیں

آخرت کے لیے کرتے نہیں ساماں کوئی
لوگ دنیا کو سجاتے ہوئے مر جاتے ہیں

تیری آنکھوں میں اتر کر یہ مصور سارے
تیری تصویر بناتے ہوئے مر جاتے ہیں

****

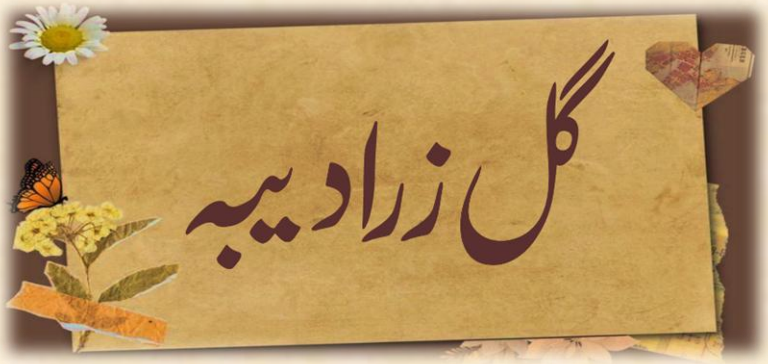

شب الم نے کہیں مجھ کو پر ملال کیا
تو دن کی دھوپ نے اکثر مجھے نڈھال کیا

شکستہ دل کی صدا بازگشت کرتی رہی
کہ دل کی آہ نے کیا دیکھئے کمال کیا

ہم اپنے نقش سر راہ چھوڑ آئے ہیں
ضرورتوں نے ہمیں کیسا پائمال کیا

تم اپنے حسن پہ نازاں رہو مگر سوچو
ہمارے عشق نے ہی تم کو بے مثال کیا

ترے خیال کے نغمے فضا میں لہرائے
مری نظر نے محبت کا جب سوال کیا

جو گل نہ ہوں گے تو کیا ہے وجود رنگ چمن
اس اک خیال نے کلیوں کو بھی نہال کیا

قفس میں رہ کے بھی جاری رکھی سعی اپنی
ادیبہ تم نے یہ اک کام بے مثال کیا

****

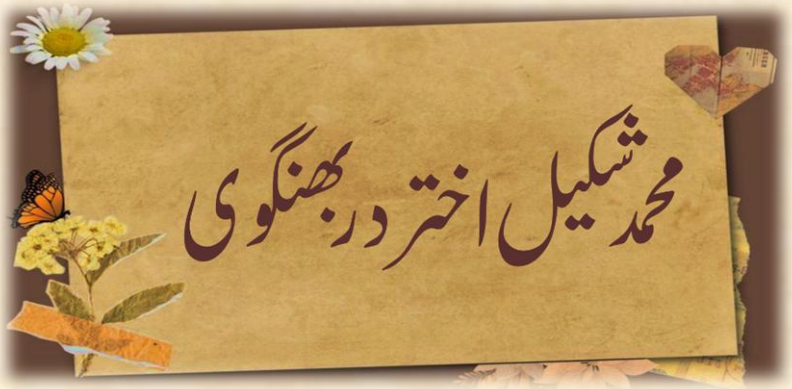

نفرت کی ان فضاؤں میں باتیں اصول کی
یعنی میاں ذراعتیں پتھر پہ پھول کی

پہلے سنہرے خوابوں میں الجھا کے رکھ دیا
بعد اسکے اس نے سانسوں کی قیمت وصول کی

بہرہ امیر شہر کا اوندھا ضمیر ہے
روداد سب سناتے ہیں کیوں کر فضول کی

حق مانگنے پہ موت کا فرمان آ گیا
حق مانگ کر لگا ہمیں ہم نے ہی بھول کی

آئینہ ہے خفا خفا اندھوں کے شہر میں
کیسے پرت دکھائے وہ چہروں پہ دھول کی

امن و اماں کی آبرو کر ڈالی تار تار
لیکن جفا کشی کو نہ اس نے قبول کی

اک رات کی دلہن کے عوض چند روٹیاں
قیمت غضب لگائی ہے ظالم نے پھول کی

کہتے ہیں لوگ مجھ پہ بھی نازل ہوا ہے عشق
مجھ کو خبر نہیں ہے اگرچہ نزول کی

وہ بھی گلاب اگنے کی رکھتا ہے اب امید
کر لی ہیں جس نے کھیتیاں اختر ببول کی

دربھنگہ، بہار، انڈیا

****

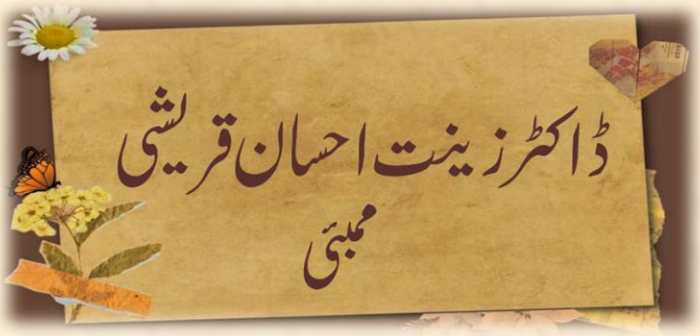

کندن ہوں غم کی آگ میں گرنے کے بعد بھی
قیمت نہیں گرے گی پگھلنے کے بعد بھی

ن جانے آفتاب میں کیسی تپش تھی آج
ٹھنڈی زمین نہ ہو سکی ڈھلنے کے بعد بھی

مضبوط عزم ہوتے نہیں جن کے دوستوں
گر جاتے ہیں وہ لوگ سنبھلنے کے بعد بھی

اس خاصیت سے پھول کی واقف ہیں سارے لوگ
جاتی نہیں ہے خوشبو مسلنے کے بعد بھی

زینت نہ مل سکی مجھے پھر منزلِ مقصود
سچائیوں کی راہ میں چلنے کے بعد بھی

****

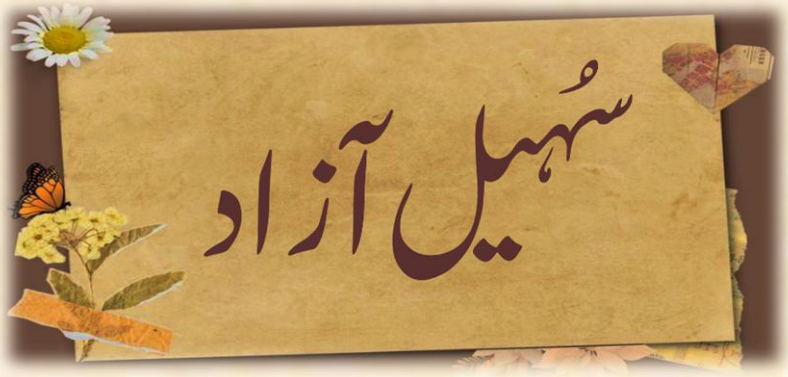

بجا، محرومیٔ امکانِ وحشت کی شکایت ہے
دلِ بیمار کو سامانِ حیرت کی شکایت ہے

کشادہ ہو نہ جائے دامنِ اُمّید ڈرتے ہیں س
ہماری تنگیٔ قسمت کو حسرت کی شکایت ہے

سوادِ چشمِ جاں لے کر سفر کو چلنے والے ہیں
مسافر! کیوں تجھے اس درجہ ظلمت کی شکایت ہے

کبھی تسخیرِ دل دیوانہ کر دینے کو کافی ہے
کبھی دل کو مگر یک مشت قامت کی شکایت ہے

کبھی اس درجہ پاسِ خامشی بھی بار لگتا ہے
یہاں ہر جنبشِ لب کو سماعت کی شکایت ہے

وہی آنکھیں جنہیں مانوس ہونا ہی نہیں آیا
انہی انکھوں کو ہم سے اجنبیت کی شکایت ہے

****

انتے ہو کہ کیا بدلنا ہے ؟
سب کچھ اُس کے سوا بدلنا ہے

ہے کوئی جو وفا کرے مجھ سے ؟
مجھ کو اک بے وفا بدلنا ہے

وہ دکھاتا ہے جو نہیں ہوں میں
مجھ کو یہ آئینہ بدلنا ہے

بھول جاتا ہوں روز گھر کا پتا
مجھ کو گھر کا پتا بدلنا ہے

منزلوں کو بدل لیا ہے بہت
اب مجھے راستہ بدلنا ہے

وہ یہ کہتا ہے میرا تھا" شارق"
اُس کے جُملے سے" تھا "بدلنا ہے

****

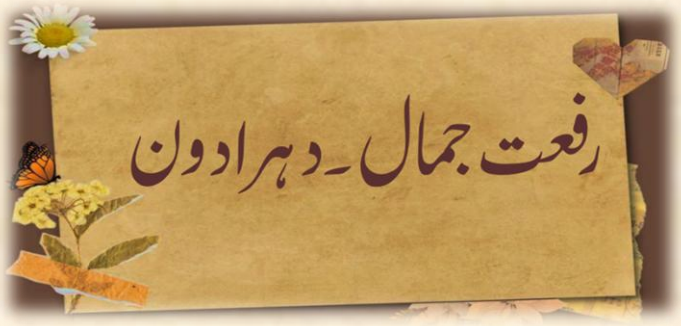

شبِ تاریک سے ہے صبح کی جانب سفر میرا
کہ رستہ تک رہی ہے تابناکی یہ سحر میرا

تھکے ماندوں کو مانندِ شجر آرام دیتی ہوں
بہت ہے لطف انگیز نوعِ انساں کو ثمر میرا

بظاہر میں بہت ہی پُر سکون معلوم ہوتی ہوں
مگر اندر سے پھونکے آگ ہی کا ہے شرر میرا

زمانے کے لیے ہر دور میں اظہارِ الفت ہوں
میں بیٹی، ماں، بہن بھی ہوں، تعارف طویل تر میرا

میں نسلِ نو کو اپنا خون پلا کر سینچ دیتی ہوں
کہ ممکن ہی نہیں ہے ذمہ داری سے مفر میرا

اگر میں سخت ہو جاؤں تو تیرا چہرہ اتر جائے
محرکِ ظلم کا تیرے وجودِ بے ضرر میرا

میں جس کا گھر بسانے میں وجود اپنا گنواتی ہوں
وہ کل میں تین کہہ دے تو نہ گھر میرا نہ در میرا

****

نظمیں

آگ کا گڑھا

سنا تھا جہنم میں آگ کا گڑھا ہو گا
گنہگار اس، میں ڈالے جائیں گے
ہاں گہنگار صرف گہنگار
ہمارے نااہل حکمرانوں نے
ہم بے گناہوں کے لیے
اس دنیا کو جہنم بناڈالا
کہیں دشمن کے ہاتھوں جارحیت سے نسلیں تباہ ہیں
کہیں رنگ و نسل کے نعرے نے برباد کیا ہے
آج ہم اپنوں کی ناانصافی سے تباہ ہیں
ہمارے دشمن ہمارے اپنے ہر محکمے میں
ہماری کھال کھینچنے کو ہماری تاک میں بیٹھے ہیں
ہم بے بس لوگ کبھی ڈمپر میں کچلے جاتے ہیں
کبھی شادی کی شاپنگ کرتے ہوئے جل کر کوئلہ بن جاتے ہیں
ہمارے نصیب میں کٹ کر مرنا، جل کر مرنا ہی لکھا ہے
یہ دنیا ہی ہمارے لیے جہنم بنادی گئی
آگ کے گڑھوں میں بے گناہوں کو جھونکا جارہا ہے
چند دنوں کا شور ہو گا پھر بے حسی کا ناچ سر بازار ہو گا
سب بھول کر اپنے کام سے لگ جائیں گے
جتنے وعدے کروڑوں کے، راکھ میں دب جائیں گے

وقت کی دھول میں ہر جرم دب جائے گا
عیش و عشرت کا دیوتا انگڑائی لے کر
جاگ جائے گا
پھر وہی عیش و طرب کے نغمے ہونگے
سانحہ بلدیہ کا ہو یا گل پلازہ کا
ایک دھندلی یاد اک خبر بن جائے گا

شاہانہ جاوید

فقط تاریخ بدلی ہے

وہی لمحے
وہی گھڑیاں
وہی بے چارگی کے پل
وہی حسرت بھری آنکھیں
اور آنکھوں میں کسی اچھی خبر کا انتظارِ مستقل ہی ہے
وہی سڑکیں
وہی کاریں
وہی فٹپاتھ پر سوتا ہوا جیون
جو کاروں سے کچل کر روز مرتا ہے
کبھی نیندوں، کبھی خوابوں کی غفلت میں
وہی سردی
وہ برفیلی، جمانے والی لمبی رات کا غلبہ
کہ جس میں زندگی ننگے بدن آرام کرتی ہے
دلاسہ باپ اب بھی اپنے بچے کو دلاتا ہے
وہ ساری خواہشیں اس کی
دلاسوں سے دباتا ہے
چھتیں اب بھی غریبوں کی ٹپکتی ہیں
ابھی بھی مائیں گیلے ہی میں سوتی ہیں

کہوں میں اور کیا آخر
زیادہ اب لکھا جاتا نہیں مجھے سے
یہی محسوس ہوتا ہے فقط تاریخ بدلی ہے
ہمارے دن نہیں بدلے
شکوہ آباد، اتر پردیش

عمران قمر

"کہیں دور وہ روشنی"

مرے ہم نفس، تُو کہیں تو ہے
مگر اب وہ بات نہیں رہی
وہ جو لمحہ لمس کا خواب تھا
وہ جو لفظ تھے تری آنکھ میں
وہ جو گیت تھے تری سانس میں
سبھی دُھند میں تحلیل ہو گئے
میں صدا کی راکھ میں بولتی رہی
تُو سکوت کے گھر میں سو گیا
کہیں دل کے پار کوئی زخم تھا
کہیں وقت کی کوئی اوٹ تھی
ہم اُسی کے بیچ رُک گئے
یہ جو دن ہیں — بے صدا، سیاہ
یہ جو رات ہے — بے کراں، طویل
انہی میں بکھر کے سوچتی ہوں میں
کہ اگر تُو ساتھ ہوتا کبھی
تو یہ دُکھ بھی خواب لگتا مجھے
کبھی وقت تھم سا جائے
جب تری یاد چھو کے گزر جائے
کبھی سانس رُک سی جاتی ہے

جب تری بات دل میں اُتر جائے
مرے ہم نفس، وہی راستے
مگر اب نشاں بدل سے گئے
تری سمت رُوشنی ہے کہیں
مرے دائرے میں دھواں رہا
میں بھی چل رہی ہوں، تُو بھی چل
مگر ایک موڑ کے بعد سے
تری دُھن الگ، مری سوچ الگ
کہیں دل رہا، کہیں خواب گئے
مرے ہم نفس، تُو کہیں تو ہے
مگر اب وہ بات نہیں رہی—
کہ جو لمس تھا، وہ خیال تھا
جو خیال تھا، وہ مٹ گیا۔

کرن ہاشمی

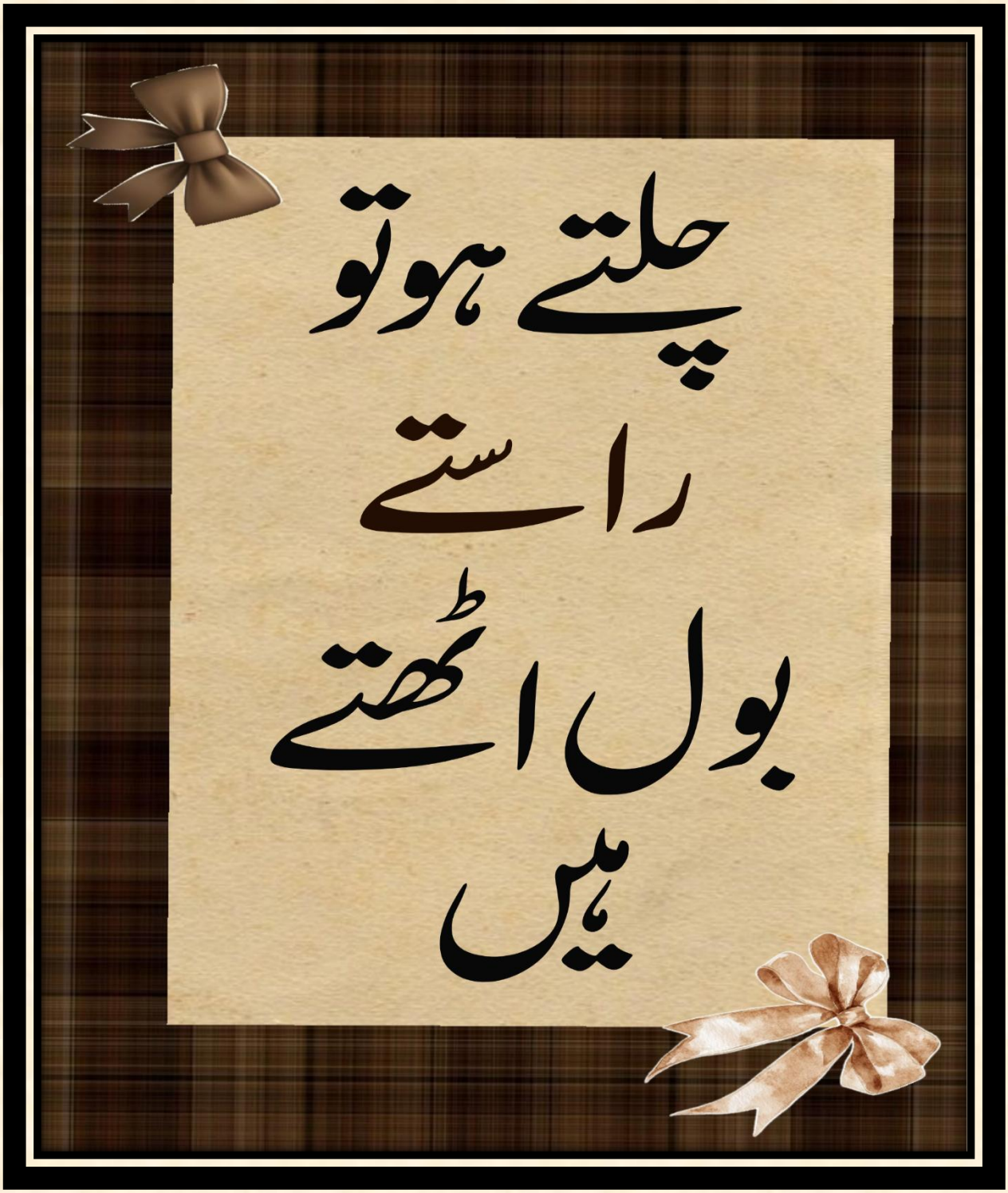
چلتے ہو تو
راستے
بول اٹھتے
ہیں

(سفر نامہ نگار کا تعارف)

ڈاکٹر رفیعہ نوشین، حیدرآباد دکن کی ایک صاحبِ نظر محقق، سماجی جہد کار، افسانہ نگار اور شاعرہ ہیں۔ ان کے فکر و فن کا محور انسانی وقار، صنفی مساوات اور عورت کی باطنی خودی ہے۔ ان کی تحریروں میں مشاہدے کی گہرائی، احساس کی لطافت اور اسلوب کی شائستگی یکجا نظر آتی ہے۔ رفیعہ نوشین بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم " بنات " (دہلی) سے وابستہ ہیں، اور متعدد قومی و عالمی ادبی سمیناروں میں اپنی وقیع شرکت سے اردو ادب کے سفر کو وسعت دے چکی ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ " قلم کی آنکھ تبھی بینا ہوتی ہے، جب انسان اپنے قدموں سے زمین کو محسوس کرے اور دل سے آسمان کو۔"

یہی بینائی، یہی لمس، اور یہی جستجو ان کے اس سلسلہ وار سفر نامے کی روح ہے۔ حال ہی میں مصنفہ نے بھوپال کے ایک ادبی و ثقافتی سفر سے واپسی پر اپنے تجربات، مشاہدات اور احساسات کو قرطاس پر منتقل کرنے کا ارادہ کیا۔ ادارتی ٹیم" نیا نظریہ "نے اس سفر نامے کو قسط وار پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

امید ہے کہ قارئین اس سلسلے کو محض سفر کی روداد نہیں، بلکہ روح کی مسافت سمجھ کر پڑھیں گے۔

پیشِ خدمت ہے اس سفر نامے نامی کی دو اقساط۔۔۔

قسط۔۔۔1

سفر صرف راستوں کا نہیں ہوتا - یہ خودی، مشاہدے اور معنی کی تلاش کا بھی سفر ہوتا ہے۔

قلم کار کے لیے ہر سفر ایک نیا باب، ایک نیا مکالمہ اور ایک نئی روشنی لے کر آتا ہے۔

انسان صدیوں سے سفر میں ہے - کبھی زمین کے کنارے ڈھونڈتا ہے، کبھی اپنے وجود کے۔

یہ انسان کو اپنے محدود دائرے سے باہر لے جاتا ہے۔ نئی جگہیں، زبانیں، چہرے، رسم و رواج، یہ سب تجربات ذہن کی کھڑکیاں کھول دیتے ہیں۔

قلم کار کے لیے یہ مشاہدہ ہی تخلیق کا ایندھن بنتا ہے۔

ہر وہ شخص جو خود کو جاننا چاہتا ہے، اور جو انسانوں کے دکھ سکھ، خوابوں اور سچائیوں کو لفظوں میں ڈھالنا چاہتا ہے، اس کے لیے سفر ناگزیر ہے۔

قلم کار کے لیے سفر محض تفریح نہیں، بلکہ ایک ادبی تربیت ہے۔

جب وہ کسی شہر کے بازار میں چلتا ہے، کسی ریلوے اسٹیشن پر چائے پیتا ہے، یا کسی بچے کو دیکھ کر مسکراتا ہے تو وہ دراصل زندگی کے ان رنگوں کو محسوس کر رہا ہوتا ہے جن سے اس کی تخلیق کو روشنی ملتی ہے۔

دنیا کے ہر بڑے ادیب نے سفر کو اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنایا۔

غالب نے کلکتہ کا سفر کیا اور خطوط میں ایک نئے انداز کی نثر پیدا کی۔

اقبال نے یورپ دیکھا تو خودی کی تعبیر بدلی۔ ہمنگوے نے جنگوں، بندرگاہوں اور طوفانوں سے کہانیاں چُنیں۔ سفر نے ان کے قلم میں وسعت، گہرائی اور روشنی پیدا کی۔ سفر کا ایک پہلو برداشت اور بصیرت بھی ہے۔

جو شخص مختلف زبانوں، ثقافتوں اور چہروں کو قریب سے دیکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ سچ صرف ایک جگہ نہیں ہوتا- ہر خطے کا اپنا سچ، اپنا درد، اپنی خوشبو ہوتی ہے۔ یہی فہم ایک قلم کار کو انسانیت کا نمائندہ بناتی ہے، محض اپنے طبقے یا علاقے کا نہیں۔

تاہم جب ہم اس منظر نامے کو تانیثی زاویے سے دیکھتے ہیں تو حقیقت کچھ مختلف نظر آتی ہے۔

دنیا بھر میں عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں سفر کے مواقع بہت کم ملتے ہیں- اس کی کئی وجوہات ہیں- سماجی، معاشی اور ثقافتی۔

صدیوں تک عورت کو گھر کی چار دیواری تک محدود رکھا گیا۔

سفر کو مہم جوئی، تجارت اور تجربے سے جوڑا گیا- ان سب کو" مردانہ صفات "کہا گیا، جبکہ عورت کے حصے میں حفاظت، قربانی اور خدمت آئی۔

یوں سفر اس کے لیے آزادی کے بجائے خطرہ بن گیا۔

آج بھی خواتین کے لیے محفوظ عوامی مقامات اور ٹرانسپورٹ کا فقدان ہے۔

اکیلی عورت کا سفر اکثر سوالات اور شک کے دائرے میں آجاتا ہے-

"اکیلی کیوں جا رہی ہے؟

کس کے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

کب واپس آئے گی۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟"

یہ وہ رکاوٹیں ہیں جو عورت کے قدموں کو سماجی طور پر باندھ دیتی ہیں، چاہے اس کے پرواز کے خواب کتنے ہی اونچے کیوں نہ ہوں۔

مگر خوش آئند بات یہ ہے کہ اب دنیا بدل رہی ہے۔

خواتین مصنفات، صحافیوں، فلم سازوں اور محققین نے سفر کو خود شناسی اور خود مختاری کی علامت بنا لیا ہے۔

آج کی عورت جب سفر کرتی ہے تو وہ صرف راستے نہیں طے کرتی بلکہ وہ صدیوں کے جمود کو توڑتی ہے۔

سفر قلم کار کے لیے روحانی ریاضت ہے۔

یہ اسے جمود سے نکالتا ہے اور سوچ کو بہاؤ دیتا ہے۔

وہ سیکھتا ہے کہ لفظوں کی اصل زندگی میں ہے، اور زندگی ہمیشہ حرکت میں رہتی ہے۔

اسی لیے کہا جاتا ہے:

"جو سفر نہیں کرتا، وہ صرف ایک صفحہ پڑھتا ہے- مگر جو سفر کرتا ہے، وہ پوری کتاب دیکھ لیتا ہے۔"

میں چاہتی ہوں کہ میں دنیا کے بدلتے نقشے دیکھوں، سڑکوں پر، اسٹیشنوں پر، اور دلوں کے بیچ بہنے والی کہانیوں کو محسوس کروں۔

کیونکہ قلم کی آنکھ تبھی بیدار ہوتی ہے جب انسان اپنے قدموں سے زمین کو چھوتا ہے، اور دل سے آسمان کو۔۔۔!

اسی لیے جب بنات (بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم، دلی) جس کی میں رکن ہوں کا نواں یومِ تاسیس 31 اکتوبر تا یکم نومبر 2025ء کو مدھیہ پردیش کے صدر مقام بھوپال میں منعقد کرنے کا طے پایا تو میں نے فوراً ارادہ کر لیا کہ مجھے بیگمات کے شہر بھوپال کے لیے رختِ سفر باندھنا ہی ہو گا۔

ریل کی گزرگاہ میں زندگی کا انعکاس"

29 اکتوبر 2025، شام

وہ شام واقعی اپنے شباب پر تھی۔

ٹیکسی شیخ پیٹ (حیدرآباد) کی طرف رواں تھی- بارش کی رم جھم نے جیسے شہر کو دھو کر نیا جنم دیا تھا، اور میں ٹیکسی کی کھڑکی سے جھانکتی ہر بوند میں اپنا عکس ڈھونڈ رہی تھی۔

تقریباً آٹھ بجے، میں ویسٹرن پلازہ، پہنچی جہاں میری دوست آرزو مہک میری منتظر تھی- اس نے پورے جوش و خروش سے میرا استقبال کیا اور مجھ سے بغلگیر ہو گئی -

دوستی دراصل وہ روشنی ہے جو دل کی کھڑکیوں کو کھول دیتی ہے- جہاں لفظ کم پڑ جائیں، وہاں احساس راستہ دکھاتا ہے۔

کچھ ابتدائی باتوں کے بعد اس نے ٹیبل پر کھانا لگا دیا- بارش کے موسم میں گرما گرم بریانی اور چکن تندوری... ذائقہ جیسے زبان پر ناچنے لگا۔ خوشگوار موڈ کے ساتھ ہم نے کھانا کھایا اور کھانے کے بعد نمازِ عشاء ادا کی-

ہم دونوں بنات کے نویں یومِ تاسیس میں شرکت کے لیے بھوپال جا رہے تھے۔ ساتھ ہی اس تاریخی شہر کا "بھوپال درشن" بھی طے تھا۔ سو یہ ضروری تھا کہ وقت کے ہر پل کا بھرپور استعمال کیا جائے۔

اس بار ہم نے ہوا کے پروں کے بجائے ریل کے سفر کا انتخاب کیا تھا، کیونکہ بہت جلد منزل پا لینے کی عجلت اکثر سفر کے حسن کو نگل لیتی ہے۔ اس کے بر عکس ریل کی پٹریوں پر لپکتے مناظر... رفتار میں چھپی آسودگی... اور دل میں جاگتا یہ یقین کہ

زندگی ایک اسٹیشن نہیں، لمحہ لمحہ بدلتا ہوا سفر ہے، کافی تسلی بخش تھا-

جب پلاننگ مکمل ہوئی تو آنکھوں میں خوشیوں اور نظاروں کی کرنیں جگمگا رہی تھیں-

مگر نیند بھی لازم تھی...

صبح 6 بجے ریلوے اسٹیشن کے لیے نکلنا تھا- سو گیارہ بجے ہم اپنے بستروں میں اگلے دن کے خواب سمیٹ کر سو گئے۔

یہ سفر فقط راستوں کا نہیں یادوں، روشنیوں، ملاقاتوں اور احساسات کی ایک حسین تسبیح تھا- جسے ہم صبح سے پرونا شروع کرنے والے تھے۔

صبح ابھی مکمل بیدار نہ ہوئی تھی-

رات کی سیاہی ہلکی روشنی میں تحلیل ہو رہی تھی۔ ہوا میں خنکی اور بارش کی خفیف سی نمی باقی تھی- جو دل کو عجیب سی تازگی بخش رہی تھی۔

5 بجے ہم نیند سے جاگے - تازہ دم ہونے کے فوری بعد آرزو نے گرما گرم چائے کا پیالہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا- جیسے ہی میں نے پہلی چسکی بھری اس کی لذت اور خوشبو نے مجھے تازگی بخشی ٹھیک چھ بجے ہم سکندرآباد ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے - اور انتظار کرنے لگے راجدھانی ایکسپریس 22691 کا جو پلیٹ فارم نمبر ایک پر آنے والی تھی -

ریل، اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئی تو ہلکی ہلکی روشنیوں کے بیچ پلیٹ فارم پر زندگی دوڑتی نظر آئی-

سامان لیے بھاگتے مسافر، چائے والوں کی آواز، ریل کی سیٹیوں میں چھپی مسافتوں کی صدائیں... ہر چیز نے گویا اعلان کیا کہ "اب سفر شروع ہونے ہی والا ہے"-

ریل پوری وقار کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑی تھی- جیسے برسوں سے ہماری ہمسفر بننے کی منتظر ہو۔ آرزو نے مسکراتے ہوئے کہا،

"دیکھو، سفر بھی کبھی کبھی انسان کا انتظار کرتا ہے!"

ہم ہنس پڑے۔ اور دل سے دعا نکلی کہ سفر محفوظ رہے، دل شاد رہے۔

بسم اللہ پڑھ کر ہم نے ریل کے دروازے میں قدم رکھا۔ سامان رکھا، نشست سنبھالی- پھر ایک نظر کھڑکی سے باہر ڈالی دل نے چپکے سے دعا کی: "اے رب! یہ راستہ خیر کا راستہ ہو-

ہم اس سفر میں گم نہ ہوں بلکہ خود کو پائیں"-

ریل نے ہلکی سی جنبش لی، اور اس کی پہلی سیٹی وقت کے نئے باب کا کھلنا تھی، جیسے کسی کتاب کی سطر اچانک زندگی بن جائے۔ ریل آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی- اور باہر بھاگتے مناظر سیاہی سے روشنی کی طرف ایک نرم تبدیلی کے ساتھ سفر کرتے گئے۔

ہر پل...

ایک نیا احساس۔۔۔۔۔۔

ایک نیا منظر۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک نئی خوشی۔۔۔۔۔۔۔۔

ریل میں سوار ہوئے کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ ریلوے کا عملہ مسکراتا ہوا نمودار ہوا اور ہر مسافر کے ہاتھ میں ایک مفت پانی کی بوتل اور انگریزی روزنامہ 'ٹائمز آف انڈیا' تھما دیا جیسے کہہ رہا ہو، "پیتے رہو... پڑھتے رہو... یا پھر پی پی کے پڑھتے رہو!"

اخبار کی سرخیاں دوڑتی نظروں کو اچانک تھم جانے پر مجبور کر رہی تھیں- "تلنگانہ میں طوفانی بارشوں کے سبب آٹھ اضلاع میں ریڈ الرٹ"

ان میں ورنگل بھی شامل تھا، جہاں سے ہماری ریل کا گزر ہونا تھا۔

کل شام سے بادلوں نے جیسے اعلان جنگ کر رکھا ہے۔

لیکن ہم... ادب کے متوالے!

آندھی ہو، طوفان ہو یا پٹریوں پر بہتا پانی۔۔۔۔۔

سمینار اور مشاعرہ کی محبت ہمیں ہر رکاوٹ سے گزار لاتی ہے۔

یہ اردو ادب کے لئے ہمارا عشق نہیں تو اور کیا ہے؟

بھوک نے وقت کی یاد دلائی۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے Pantry کی جانب سے ناشتہ پیش ہوا-

بریڈ اور انڈے کا سینڈوچ، ساتھ میں ابلی ہوئی مٹر اور گاجریں-اور پھر الائچی کی خوشبو والی چائے، جیسے سفر کے ذائقے کی مہر!

اکثر خواتین لباس اور زیور کی میچنگ میں کبھی چوکتی نہیں، لیکن ہم جیسے عاشقانِ قلم اس کے ساتھ ساتھ میچنگ ادب کا بھی اہتمام کرتے ہیں-چائے کا آخری گھونٹ ختم ہوا نہیں تھا کہ ہم نے فوراً سنگیتا والٹ کی ناول "پلیٹ فارم ٹکٹ" نکال لی-

ریل کا سفر... اور ریل کی کہانیاں...

اس سے بڑھ کر میچنگ ادب بھلا اور کیا ہو سکتا ہے؟

سنگیتا والٹ نے چودہ برسوں تک پلیٹ فارمز کی دھڑکنوں کے درمیان جی کر انہی 'ان کہی کہانیوں' کو قلم بند کیا ہے جو ہر روز آنکھوں کے سامنے سے گزرتی ہیں مگر دل کم ہی پڑھ پاتے ہیں۔

ٹکٹ چیکروں کی پیشانی کی شکنیں، پلیٹ فارم کی بھاگتی دوڑتی زندگی، کوچوں میں الجھی مسافروں کی تقدیریں، یہ سب اس ناول میں سانس لیتے کرداروں کی صورت میں زندہ ہیں۔

ہم بھی اس وقت ایک پٹری سے دوسری پٹری پر چھلانگ لگاتی زندگی کے مسافر ہی تو ہیں-جو لفظوں کی کھڑکی سے جھانکتے اپنے ہی سفر کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ریل چھک چھک کرتی اپنی دھن میں مگن چلی جا رہی تھی-سبزہ زار کبھی ساتھ ساتھ دوڑتے تو کبھی اچانک دھند میں چھپ جاتے ہیں-جیسے کوئی پرانا دکھ دل کے پردے میں گم ہو جائے۔ مناظر آنکھوں میں نہیں دل میں عکس بنا رہے تھے۔

ریل کی چھک چھک نے مجھے بھوپال کی معروف شاعرہ انجم رہبر کا وہ گیت یاد دلایا جو کافی مقبول ہے-

چھک چھک چھک ریل چلی ہے جیون کی...

ہنسنا، رونا... کھونا پانا...

ساماں باندھ کے رکھو لیکن چوروں سے ہوشیار رہو...

جانے کب سیٹی بج جائے... سگنل جائے جھک... جھک۔۔۔۔۔۔ جھک۔۔۔۔۔۔۔

ریل کی آواز... وقت کی نبض اور ہم اس نبض پر چلتے مسافر کب رک جائیں؟ کب بڑھ جائیں؟

کسے خبر۔۔۔۔۔؟

ہم جانتے ہیں جھیلوں اور نوابوں کے شہر بھوپال کی مہک ہمارے استقبال کو بے چین ہے۔ اور ہم۔۔۔۔۔۔

بنات کے نویں یومِ تاسیس کی خوشیوں کے ہم راہی امیدوں کی پٹری پر مسلسل رواں...

قلم سے دوستی نبھاتے ہوئے۔۔۔۔۔۔

ہم کبھی ناول کے صفحات میں کھو جاتے، کبھی سفر نامے کی سطروں میں اپنے احساسات رقم کرتے۔ درمیان میں فون کالز بھی آتی رہیں، اور میسجز کے جواب بھی دیتے رہے مگر کھڑکی سے باہر گزرتے مناظر، دل کو سب سے زیادہ اپنی طرف بلا رہے تھے۔ پٹریوں پر دوڑتی ٹرین کا شور، جیسے کوئی موسیقی... اور ہم اس دھن میں محوِ سفر تھے۔ راجدھانی ایکسپریس صرف دوڑ نہیں رہی تھی، بلکہ جیسے ہمیں اپنے پیار اور دعاؤں کی منزل کی طرف لے جانے کا دعویٰ کر رہی تھی۔

بوگی میں ہمسفر تو بہت تھے، مگر دل کے قریب کوئی نہ تھا۔ سامنے بیٹھا نیا شادی شدہ جوڑا محبت کی مدھ بھری دنیا میں ڈوبا ہوا تھا- اُن کی مسکراہٹیں بھی الگ زبان بول رہی تھیں۔ ایک نوجوان تھا جو مستقبل کی دوڑ میں مصروف، لیپ ٹاپ پر جھکا اپنی پریزنٹیشن میں گم تھا- اسے خلل ڈالنا ہماری شائستگی کے خلاف تھا۔ یوں میں اور آرزو ہی ساتھ تھے- اور ہم اور ہماری سوچیں تھیں۔

وقت نے بھی جیسے پر لگا رکھے تھے- دیکھتے ہی دیکھتے ڈیڑھ بج چکا تھا۔ اچانک ٹرالی کی گھنٹی بجی اور کھانا حاضر۔ سادگی سے سجی دو چوکور روٹیاں، آلو گاجر کی سبزی، دال کا بھاپ اُڑاتا پیالہ، چاول، ذائقے کو جگاتا اچار، دہی اور آخری میں دل کو خوش کر دینے والی آئسکریم...! بظاہر معمولی، مگر اس تھکان بھرے سفر میں کسی نعمت سے کم نہ تھا۔

ہم نے شکر بھری سانس کے ساتھ کھانا کھایا، دل سے دعا نکلی- اے اللہ! یہ سفر بخیر ہو، اور یہ لمحے ہمیشہ ایسے ہی مہکتے رہیں...

(جاری ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

لگا رہیں
مضامینِ
نو کے
پھر انبار---

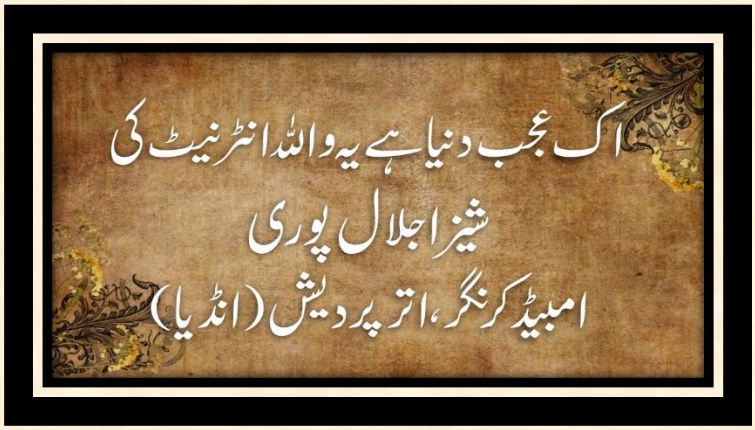

انسان کی تاریخ ہمیشہ تبدیلیوں سے بھری رہی ہے۔ ہر دور میں کوئی نہ کوئی ایجاد آئی، کسی نہ کسی نئی سہولت نے جنم لیا اور تہذیب نے ایک نئی کروٹ لی۔ مگر جس انقلاب نے دل و دماغ، عادت و مزاج، طرزِ زندگی اور فیصلوں تک کو بدل کر رکھ دیا، وہ یہ نئی ڈیجیٹل دنیا ہے۔ یہ دنیا نہ شہر کی گلیوں میں نظر آتی ہے، نہ کسی ملک کے نقشے میں کہیں دکھائی دیتی ہے، مگر پھر بھی ہم سب اسی کے باسی ہیں۔ ہم جاگتے ہیں تو یہ ہمارے ساتھ ہوتی ہے، سوتے ہیں تو بھی کہیں نہ کہیں اس کی موجودگی ہمارے ارد گرد رہتی ہے۔

ایک وقت تھا جب خط لکھنے میں دن لگ جاتے تھے، پیغام پہنچنے تک جذبات کی شدت کم بھی ہو جاتی تھی اور انتظار کا ذائقہ بھی الگ ہوتا تھا۔ آج کلک کی ایک جنبش فاصلے مٹا دیتی ہے۔ کبھی علم کے حصول کے لیے برسوں محنت کرنا پڑتی تھی، کتابیں ڈھونڈنی پڑتی تھیں، استاد کے در تک رسائی سب کے بس کی بات نہ تھی۔ اب ایک چھوٹا سا آلہ ہاتھ میں ہو تو دنیا کی سب سے بڑی لائبریری بھی گویا پاس آ جاتی ہے۔ علم تک پہنچنا آسان ہوا، مواقع وسیع ہوئے، سوچ کے در کھلے اور کئی نامعلوم ذہن دنیا کے سامنے آئے۔ ایک گاؤں کے طالب علم نے بڑے شہر کے بچے کے برابر مواقع حاصل کر لیے۔ کوئی لکھنے والا پہچانا گیا، کوئی پڑھنے والا معتبر ہوا، کوئی بولنے والا پہلا موقع پا کر لاکھوں دلوں تک پہنچ گیا۔

لیکن کہانی کا دوسرا رخ بھی ہے۔ جہاں یہ دنیا سہولت دیتی ہے وہاں آزمائش بھی پیدا کرتی ہے۔ جہاں یہ ذہن روشن کرتی ہے وہیں کبھی کبھی دھند بھی بٹھا دیتی ہے۔ یہاں ہر بات سچ نہیں ہوتی، ہر تصویر حقیقت نہیں ہوتی، ہر "خبر" حقیقت کا روپ نہیں رکھتی۔ یہاں شہرت فوراً ملتی ہے مگر کردار کا امتحان بھی اسی رفتار سے لیا جاتا ہے۔ یہ دنیا بڑی روشن بھی ہے اور کبھی کبھی اندھیری بھی محسوس ہوتی ہے۔

یہ ایک ایسا جہان ہے جہاں تعلقات بنتے بھی ہیں اور ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔ کچھ رشتے حرفوں سے مضبوط ہوتے ہیں، کچھ صرف الفاظ کے کھیل بن کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ امید کا وسیلہ ہے، کچھ کے لیے پریشانی۔ کسی نوجوان کے لیے یہ خواب پورا کرنے کا راستہ بنتا ہے تو کسی کے لیے احساسِ کمتری کی دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔ کوئی اپنی پہچان بناتا ہے، تو کوئی بھیڑ میں کھو جاتا ہے۔

اس نے دنیا کو قریب بھی کیا ہے اور دور بھی۔ لوگ ایک دوسرے کے ہنسنے رونے سے واقف بھی ہیں مگر اکثر چہروں کے پیچھے چھپی تھکن سے ناواقف۔ گھروں میں بیٹھ کر ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے کبھی کبھی ایک دوسرے سے کم بات کرتے ہیں اور دور بیٹھے اجنبی بہتر سمجھنے لگتے ہیں۔ جذبات کے اظہار کا ایک نیا انداز ضرور ملا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بے نام تنہائیاں بھی اسی دنیا نے بڑھادی ہیں۔

یہ طاقت صرف رابطے کی نہیں بلکہ تشکیلِ کردار کی بھی ہے۔ یہاں الفاظ بنتے ہیں، سوچیں ڈالی جاتی ہیں، نظریات تشکیل پاتے ہیں۔ اس لیے یہاں رہنا عقل بھی مانگتا ہے، ضبط بھی اور ذمہ داری بھی۔ ہر دیکھی ہوئی چیز پر یقین نہیں کیا جاسکتا، ہر سنائی دی بات پر فیصلہ نہیں دیا جاسکتا۔ شعور کے بغیر یہ سہولت بوجھ بن جاتی ہے، ذمہ داری کے بغیر یہ آزادی بے مہار گھوڑا ثابت ہوتی ہے۔

اس دنیا نے تعلیم کے دروازے کھولے، کاروبار کے طریقے بدل دیے، سیاست کے انداز بدل دیے، صحافت کی روح کو نئی شناخت دی۔ خبر کا سفر لمحوں میں طے ہونے لگا، آوازیں دبی بند ہو گئیں، کمزور بھی اپنی بات کہنے کے قابل ہو گئے۔ کسی دور دراز کے علاقے میں بیٹھا ایک شخص بھی اب عالمی گفتگو کا حصہ بن سکتا ہے۔ یہی طاقت اگر مثبت رخ پکڑ لے تو قومیں بدل سکتی ہیں، نسلیں محفوظ ہو سکتی ہیں اور معاشرہ مضبوط ہو سکتا ہے۔

لیکن یہ ذمہ داری بھی دیتی ہے کہ ہم اسے اپنی زندگی پر مکمل مسلط نہ کر دیں۔ گھر کی محفلیں خاموش نہ ہوں، رشتوں کی حرارت محض اسکرین کے روشنی بردہ شور میں گم نہ ہو جائے۔ بچوں کو صرف آلات نہ دیں بلکہ ان کے ساتھ سمجھ بھی دیں، تربیت بھی دیں۔ نوجوانوں کو صرف رفتار نہ دیں بلکہ سمت بھی عطا کریں۔ انسان کو یاد رہے کہ اصل زندگی اب بھی وہی ہے جہاں ہاتھوں کی گرمی محسوس ہوتی ہے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو ہوتی ہے، حقیقی مسکراہٹ چہروں پر دکھائی دیتی ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دنیا کے ساتھ توازن قائم رکھا جائے۔ نہ اس سے بھاگا جاسکتا ہے نہ اسے مکمل جنون بنایا جاسکتا ہے۔ اسے ذریعہ بنایا جائے، مقصد نہ بنایا جائے۔ اسے سہارا رکھا جائے مگر زندگی کا مرکز نہ ٹھہرایا جائے۔ اگر شعور کے ساتھ اس کا استعمال ہو تو یہی دنیا انسان کو آگے بڑھائے گی، ترقی کے راستے کھولے گی، محبتوں کو جوڑے گی، ذہنوں کو وسعت دے گی اور معاشرے کو بہتر بنا سکتی ہے۔ بصورتِ دیگر یہ سہولت بوجھ بن سکتی ہے اور آزادی بے سمتی میں بدل سکتی ہے۔

ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ طاقت ہمیشہ مفید نہیں رہتی، فائدہ اسی وقت بنتی ہے جب اسے دانائی کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ یہی دانائی مستقبل کا اصل چراغ ہے، یہی شعور ہماری حقیقی حفاظت ہے، اور یہی احساس ہمیں اس بدلتی دنیا میں متوازن رکھ سکتا ہے۔

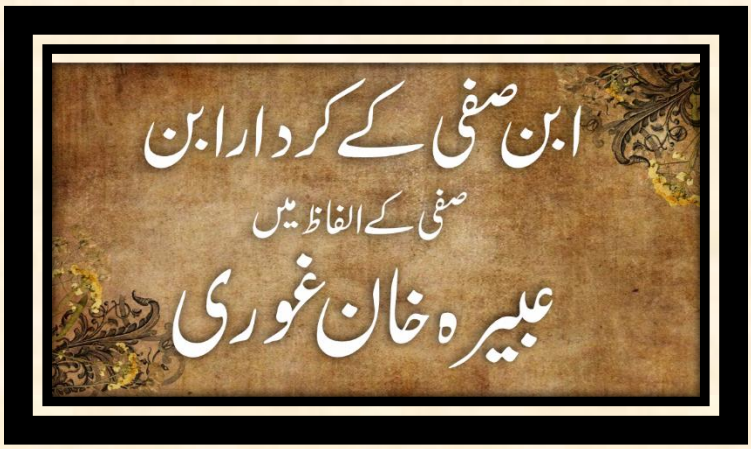

پاپولر فکشن میں عرصہ دراز سے بہت کچھ لکھا جارہا ہے اور مقبول بھی ہوتا رہا ہے لیکن کچھ تحریریں ایسی ہوتی ہیں جو وقت کے امتحان میں پورا اترتی ہیں اور تخلیق کے سالوں بعد بھی زندہ رہتی ہیں۔۔۔ابن صفی کی تحریریں اس چیز کی مثال ہیں کہ لکھے جانے کے ساٹھ ستر سال بعد بھی وہ ذوق وشوق سے پڑھی جارہی ہیں۔۔اس کی دو اہم وجوہات میں سے ایک ان کی تحریروں میں زبان وبیان کی چاشنی اور دوسرا ان کے زندہ جاوید کردار ہیں۔۔یہ وہ کردار ہیں جو اس دور کے ہیرو تو تھے ہی آج بھی لوگوں کے دل ودماغ پر راج کرتے ہیں۔

ابن صفی کے مرکزی کردار عمران فریدی اور حمید کو جاسوسی ادب میں جس طرح بار بار دہرایا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور شاید ایک ریکارڈ بھی ہے کہ کسی مصنف کے کرداروں کی نقل سینکڑوں لکھنے والے کریں۔۔ان مرکزی کرداروں پر ریسرچ، مقالے اور کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔۔ان مرکزی کرداروں کے علاوہ ابن صفی نے کئی شاہکار ولن بھی تخلیق کئے ہیں جو مختلف پس منظر اور صلاحیتوں کے ساتھ قاری کو انسانی فطرت کے نئے پہلوؤں سے روشناس کراتے ہیں۔۔

لیکن ان سب سے بڑا کمال وہ چھوٹے چھوٹے کردار ہیں جو شاید دو چار ناولوں اور کبھی کبھار تو چند صفحات تک ہی محدود ہوتے ہیں لیکن وہ کردار اپنے تاثر میں اتنے زور آور ہوتے ہیں کہ قاری انھیں برسوں نہیں بھولتا۔۔

موج خیال میں شروع ہونے والے اس سلسلہ میں ہم ایسے ہی کئی کرداروں کا تعارف ایک انوکھے انداز میں کرائیں گے۔۔عبیرہ خان غوری نے بہت جانفشانی سے مختلف ناولوں ابن صفی کے ہی الفاظ منتخب کرکے ان کرداروں کا کچھ اس طرح خاکہ تیار کیا ہے کہ پڑھتے ہی ان کرداروں کی ظاہری شخصیت اور خصوصیات نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔

کردار #1

صبیحہ

ناک میں دم کر رکھا تھا گھر بھر کا۔۔۔ وہ ایسی ہی تھی۔ ایم اے کے پہلے سال میں پڑھتی تھی فلسفہ لے رکھا تھا۔۔ باپ آزاد خیال اور جدت پسند تھے اور ماں اول درجے کی قدامت پسند۔۔ نقاب ڈالے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں اور شوہر پر خار کھاتی تھیں کہ بیٹی کو اتنی آزادی کیوں دے رکھی ہے۔ صبیحہ نے انہیں اتنا پریشان کیا تھا کہ قریب قریب مامتا کے جذبات ہی فنا ہو کر رہ گئے تھے اور اب وہ ان کے لئے ایک ایسی ہستی بن گئی تھی جس کی صورت دیکھتے ہی غصہ آجانا لازمی تھا۔

باپ کبھی کسی مسئلے میں دخل نہیں دیتے تھے کچھ بھی ہو رہا ہو ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔۔۔ صبیحہ کی شوخیوں پر صرف مسکرا کر رہ جاتے تھے کبھی اس سے کسی بات کی باز پرس نہیں کی تھی۔۔ اگر وہ اپنے کسی بوائے فرینڈ کو بھی گھر پر بلا لیتی تو شائد انہیں اعتراض نہ ہوتا ویسے صبیحہ نے کبھی ایسا کیا نہیں تھا۔۔ تھا ہی نہیں کوئی بوائے فرینڈ۔۔ وہ تو محض اپنی ماں اور نانی کو جلانے کے لئے کسی سہیلی کے بھائی کا تذکرہ کے بیٹھتی۔۔۔ وہ چیختی چلاتیں اور صبیحہ بڑی سنجیدگی سے کہتی" ارے بس دوستی ہے ان سے کوئی میرے عاشق تھوڑا ہی ہیں"۔

ماں لفظ عاشق پر ہزاروں باتیں سناتیں اور کہتیں" ارے کمبخت یہ تو بازاری عورتوں کے سے انداز میں کیوں باتیں کرنے لگتی ہے۔؟"

اس پر وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں سمجھاتی کہ عاشق کو عاشق ہی کہیں گے۔۔۔ ناشتہ دان نہیں.... ویسے اگر ناشتہ دان کہنے سے مفہوم پورا ہو جائے تو مجنوں لیلیٰ کا عاشق تھا کہنے کی بجائے مجنوں لیلیٰ کا ناشتہ دان تھا بھی کہہ سکتی ہے۔

ایسی باتوں پر انہیں اس زور سے غصہ آتا کہ ان کی زبان ہی بند ہو جاتی اور پھر نانی جو شروع کرتیں گالی اور کوسنے تو ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ۔۔۔ نئی نئی اصطلاحیں سننے میں آتیں۔۔۔ وہ آدھی اردو اور آدھی پوربی میں ویسے بھی گفتگو کرتیں۔۔۔ غصے کی حالت میں پوربی اور اردو کچھ اس طرح سے گڈمڈ ہوتی کہ ایک تیسری زبان عالم وجود میں آجاتی جسے شائد وہ خود بھی نہ سمجھ پاتیں۔

صبیحہ دوسروں کو چڑانے میں ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرتی تھی۔۔۔ جب کسی کو اپنی باتوں پر جھنجھلاہٹ میں مبتلا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے سارے جسم میں ہلکی ہلکی سرور انگیز سی گدگدی ہو رہی ہو۔

جس دن اسے کوئی ایسا موقع نصیب نہ ہوتا بجھی بجھی سی رہتی کسی کام میں دل ہی نہ لگتا۔ لوگوں کو جھلاہٹ میں مبتلا کرنے کے لئے نئی نئی حرکتیں کرتی یہ سوچے سمجھے بغیر کے ان کا انجام کہیں کسی حادثے کی شکل میں ظاہر نہ ہو۔

آج شام صبیحہ بہت اداس تھی گھر میں جی ہی نہیں لگ رہا تھا اس نے سوچا پبلک گارڈن تک ہی ہو آئے۔۔۔ اس دوران میں ایک نیا ڈرائیور بھی آگیا تھا اور خود ڈرائیو کرنے کی صورت میں باپ کی خفگی کا بھی خدشہ نہیں تھا۔

گارڈن کے پارکنگ کے حصے میں پہنچ کر اس نے ایک ایسے آدمی کو لمبی سی گاڑی سے اترتے دیکھا کہ بانچھیں کھل گئیں۔۔۔۔یہ اختر تھا۔۔۔سو فیصدی اختر۔۔۔لیکن وہ کون تھا وہ لحیم شحیم حبشی جو نہایت ادب سے اس کے لئے دروازہ کھولے کھڑا تھا اور اس نے دونوں پہلوؤں سے دو ریوالور بھی لٹکا رکھے تھے۔

جیسے ہی اس کے ڈرائیور نے کار پارک کی وہ جھپٹ کر نیچے اتر آئی۔۔۔اور بے خیالی میں تقریبا دوڑتی ہوئی ان لوگوں کی طرف چل پڑی.

"اختر۔۔۔۔۔اختر۔۔۔۔ "!قریب پہنچنے سے قبل ہی بے اختیارانہ طور پر اس نے اسے آوازیں دیں لیکن اس نے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔

اس حرکت پر وہ جھنجھلا گئی اور تیزی سے دو قدم آگے بڑھ کر ان کا راستہ روک لیا۔

"تم سنتے کیوں نہیں.؟"

"جی۔۔۔۔ "!اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا

"اونچا سننے لگے ہو.؟"

"معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں ".نہایت خشک لہجے میں جواب ملا

وہ سمجھی شائد حسب عادت اسے پریشان کرنا چاہتا ہے اس لئے مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولی " اختر صاحب جیل چلے جایئے بہت اودھم مچایا ہے آپ نے".

" آپ کو یقیناغلط فہمی ہوئی ہے محترمہ۔ "پہلے سے بھی زیادہ خشک لہجے میں جواب ملا " میرا نام اختر نہیں۔۔۔علی عمران ہے".

اور پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

وہ وہیں کھڑی کھسیاہٹ میں طرح طرح کے منہ بناتی رہی پھر یک بیک اپنی گاڑی کی طرف مڑی۔۔۔دوڑتی ہوئی گاڑی تک آئی اور دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر گر گئی۔

"گھر چلو "!... اس نے بھرائی ہوئی آواز میں ڈرائیور سے کہا

"جی بی بی۔۔۔۔جی۔۔۔۔گھر چلوں.؟ "ڈرائیور کی لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں۔۔۔گھر "!. وہ چیخ کر بولی " کیا تم نے سنا نہیں.؟"

گاڑی چل پڑی صبیحہ کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ غصے کے مارے ہانپ رہی تھی پھر یک بیک اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

شفق کی سرخی پر آہستہ آہستہ سیاہی غالب آتی جا رہی تھی۔

عمران سیریز ناول::::: بیباکوں کی تلاش

کردار#2

"عامرہ"

برآمدہ پوری طرح روشن تھا اور وہاں ایک لڑکی آرام کرسی پر نیم دراز برآمدے کے باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں گھورے جا رہی تھی لیکن آنکھوں کی ویرانی نے پورے چہرے کو نجانے کیا بنا کر رکھ دیا تھا۔

"عامرہ "!... بابا نے کچھ فاصلے پر رک کر اسے آواز دی۔

وہ چونک کر مڑی تھی لیکن دیکھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے بیکراں وسعتوں میں کسی حقیر سے ذرے کو مرکز نگاہ بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"تو آج بھی میرے احترام کو نہیں اٹھی.؟"

"احترام...! کس کا احترام۔۔۔ میرے علاوہ اس وسیع کائنات میں اور ہے کون.؟ "وہ بولی تھی اور ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کہیں دو گھنٹیاں سی بجی ہوں۔

"خان ضرغام بھی ہے"!.

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں اپنے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ سکوں۔"

"خان ضرغام کا وجود ہے۔۔۔ کیا تو نے اسے نہیں دیکھا...؟"

"میں کسی کو بھی نہیں دیکھتی۔۔۔ تم جو بول رہے ہو۔۔۔ محض ایک آواز ہو اور بس۔۔۔ میں تمہیں سن رہی ہوں دیکھ نہیں رہی۔"

تم خان ولا جاؤ گی اور اپنے طریقے سے خان ضرغام کا خاتمہ کر دو گی۔۔۔ میری طرف دیکھ۔۔۔ مجھ سے آنکھیں ملا ورنہ میں تجھے آسمان سے زمین پر کھینچ لاؤں گا".

"نہیں۔۔۔۔ "!دفعتاً وہ خوفزدہ آواز میں بولی" مجھے آسمان سے زمین پر مت لانا۔۔۔ تم جو کہو گے کروں گی۔"

"بس تو پھر خان ولا جانے کی تیاری کر"!...

"میں تیار ہوں ".اس نے کہا اور کرسی سے اٹھ کر ایک جانب بڑھ گئی۔۔۔ صرف اس کے پیر حرکت کر رہے تھے چہرے پر بھی ایسا کوئی تاثر نہیں تھا جیسے وہ چل رہی ہو۔۔۔ ایسا ہی لگتا تھا جیسے کوئی لاش اٹھ کر چلنے لگی ہو۔

اور پھر برآمدے کے باہر پھیلے ہوئے اندھیرے نے اسے بھی نگل لیا۔

"اب ایک تماشا بھی دیکھ لو ". عامرہ نے کہا اور ٹوکری کے قریب آ گئی۔ جھک کر اس کا ڈھکنا اٹھایا تھا کمرے کی محدود فضا میں سانپ کی پھپھکار گونج کر رہ گئی۔۔۔ ٹوکری میں ایک بڑا سا کوبرا پھن اٹھائے آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔

لٹل فی بوکھلا کر کرسی پر کھڑا ہو گیا ادھر عامرہ دوزانو ہو کر ٹوکری کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

"ارے۔۔۔ارے یہ کیا کر رہی ہو..؟ "وہ کرسی پر پاگلوں کی طرح اچھلتا ہوا بولا

عامرہ آہستہ آہستہ اپنا چہرہ سانپ کے پھن کے قریب لے جا رہی تھی سانپ نے جھپٹ کر اس کے گال پر پھن مارا اور وہ" سی "کر کے پیچھے ہٹ گئی اور ڈسے جانے والے گال کو دونوں ہاتھوں سے دبائے فرش کی طرف جھکتی چلی گئی۔

لٹل فی حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخے جا رہا تھا۔

اچانک سانپ کا پھن ڈھیلا پڑنے لگا۔۔۔اور وہ ٹوکرے سے فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔۔۔پھر وہ بالکل ہی ساکت ہو گیا۔

لٹل فی نے عامرہ کی نشیلی سی ہنسی سنی وہ فرش سے اٹھ کر کھڑی جھوم رہی تھی۔

"تم نے دیکھا...؟ "وہ لٹل فی کی طرف انگلی اٹھا کر بولی" مجھے ڈس کر خود مر گیا۔۔۔کیوں مر گیا۔۔۔میرے زہر کی وجہ سے۔۔۔اور اس کے زیر سے مجھے صرف نشہ ہوا ہے۔۔۔کیا سمجھے۔۔۔جاؤ بھاگ جاؤ۔۔۔مجھے تم پر رحم آ رہا ہے۔"

"یہ۔۔۔تت۔۔۔تمہارے زہر سے مرا ہے...؟ "لٹل فی ہکلایا

"ہاں۔۔۔میں اتنی زہریلی ہوں۔۔۔اور نشے کے لئے اس طرح سانپ کا زہر استعمال کرتی ہوں۔۔۔سانپ کے زہر کے علاوہ مجھے اور کسی چیز سے نشہ نہیں ہوتا۔۔۔ایک بار کا ڈسا جانا گھنٹوں کے لئے کافی ہوتا ہے۔۔۔بھاگ جاؤ ".

لٹل فی نے کرسی سے چھلانگ لگائی تھی اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

عامرہ کے نشے میں ڈوبے ہوئے قہقہے کمرے میں گونجتے رہے۔

تین بج رہے تھے جب بابا کی اقامت گاہ پر چھاپہ پڑا۔۔۔عمران کو اس زہریلی عورت کی تلاش تھی جس کا ذکر لٹل فی نے کیا تھا۔وہ اپنی خواب گاہ میں سو رہی تھی جگائی گئی۔۔۔لیکن جیسے ہی اسے سیچوئیشن کا علم ہوا اس کی آنکھیں پہلے سے بھی زیادہ ویران نظر آنے لگیں لیکن وہ ہنس رہی تھی۔۔۔۔عجیب سی لگ رہی تھی وہ ہنسی ان ویران آنکھوں تلے۔۔۔دفعتاً اس نے تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال لیا اور پولیس والوں کی طرف اٹھاتی ہوئی بولی" اپنے ہاتھ اٹھاؤ کیونکہ تم لوگوں کی وجہ سے مجھے آسمان سے زمین پر آنا پڑا ہے۔"

ان کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے ان میں عمران بھی شامل تھا۔

پھر اچانک اس نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا آن واحد میں بستر پر ڈھیر ہو گئی تھی۔

اور یہ اتنی سرعت سے ہوا تھا کہ کوئی کچھ بھی نہ کر سکا۔

(بابا سگ پرست)

کردار #3

پراسرار" جمیلہ "

دفعتاً اس کا منہ حیرت سے کھل گیا. داہنی طرف کے ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ایک انتہائی حسین لڑکی شب خوابی کے لبادے میں ملبوس کھڑی انہیں غمناک انداز میں دیکھ رہی تھی. اس کے بال پشتون پر بکھرے ہوئے تھے. اس کی عمر انیس یا بیس سے کسی طرح زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی.

فریدی کھڑا ہو گیا

"میں تم لوگوں کے لئے مغموم ہوں ". لڑکی نے مضمحل آواز میں کہا.

"کوئی ایسی بات نہیں "فریدی مسکرا کر بولا" ہمارے زخم معمولی ہیں. البتہ آپ کی ہمدردی کا شکریہ ".

"تم میں سے فرقلوس کا بیٹا اوسرس کون ہے ". لڑکی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا.

فریدی اور حمید گھبرا کر ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنے لگے.

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" . فریدی نے تحیر آمیز لہجے میں کہا.

"اوہ شاید تمہیں غموں نے پاگل کر دیا ہے. تم دونوں زخمی ہو. لیکن گھبراؤ نہیں. زفورس..... میرا زفورس تمہارے لئے لڑ رہا ہے. وہ تمہارے دشمنوں کو شکست دے کر ایک دن ضرور واپس آئے گا. مجھے دیکھو.... میں خود یہاں اسیر ہوں. لیکن مجھے امید ہے کہ ایک دن زفورس مجھے اس قید سے رہائی دلائے گا. کئی دنوں سے میرے کچھ سپاہی یہاں آتے ہیں. وہ موقعے کی تلاش میں ہیں. کسی دن یہاں شب خون ضرور ماریں گے" .

"محترمہ شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" . فریدی نے سنجیدگی سے کہا.

لڑکی کے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی.

فریدی کی توجہ کا مرکز زیادہ تر منجھلی لڑکی جمیلہ بنی ہوئی تھی. اس وقت اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ حد درجہ چڑچڑی ہے ہونٹ سکڑے ہوئے تھے. دونوں ابروؤں کے درمیان ایک ابھری ہوئی شکن تھی جو اس کے تیکھے مزاج کی غمازی کر رہی تھی. ابروؤں میں ایک خاص قسم کا تناؤ تھا جس کا خوش مزاجی سے دور کا بھی لگاؤ نہیں معلوم ہوتا تھا.......... لیکن...... فریدی سوچ میں پڑ گیا. پچھلی رات کو تو اس کے چہرے کے خطوط بڑے دل آویز معلوم ہو رہے تھے. سبک اور حسین ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کی نشہ انگیز تھرتھراہٹ تھی. ماتھے پر وہ بدنما سلوٹ بھی نہیں تھی. ابروؤں میں تیکھے پن کا شائبہ بھی نہیں تھا.

پارک میں روشنی دکھائی دے رہی تھی. بعد میں حمید نے دیکھا کہ وہ ایک مشعل کی روشنی تھی. جمیلہ اپنے ہاتھوں میں مشعل اٹھائے اور بایاں ہاتھ سینے پر رکھے بتوں کے درمیان کھڑی تھی. وہ دونوں ڈائنا کے بت کے قرب وجوار میں اگی ہوئی مالتی کی جھاڑیوں میں چھپ گئے. اس وقت جمیلہ سچ مچ اب سے ہزاروں برس پہلے کی عورت معلوم ہو رہی تھی. ٹخنوں تک لپٹا ہوا ڈھیلا لبادہ اس وقت جدید طرز کا سلیپنگ گاؤن نہیں معلوم ہوتا تھا. بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے اور ایک سرکش سی لٹ چہرے کے سامنے لہرا رہی تھی اور مشعل کی سرخ روشنی میں اس کا چہرہ انگارے کی طرح مہک رہا تھا.

پانچ منٹ گزر گئے لیکن فریدی واپس نہ آیا حمید اکتا کر برآمدے میں نکل جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس بار کسی دوسری عورت نے اسے مخاطب کیا.

وہ بوکھلا کر مڑا. صولت مرزا کی دوسری پراسرار لڑکی جمیلہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی. اس کے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی. جمیلہ عادت کے مطابق اس وقت بھی اپنی تیکھی سنجیدگی کا مظاہرہ کر رہی تھی.

"فف... فرمایئے ". حمید ایک قدم پیچھے ہٹتا ہوا بولا.

"چلے جاؤ... تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ ". وہ ڈرامائی انداز سے تیز قسم کی سرگوشی میں بولی.

اس کی آنکھیں حد درجہ خوفناک معلوم ہو رہی تھیں. ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور ماتھے کی سلوٹیں اور زیادہ نمایاں ہو گئی تھیں. وہ اس سے دو قدم کے فاصلے پر رک گئی.

"چچ... چلے... جائیں گے... بب.... بیل... بالکل چلے جائیں گے ". حمید پیچھے کھسکتا ہوا بولا.

وہ چند لمحے کھڑی اسے حقارت آمیز نظروں سے دیکھتی رہی پھر دفعتاً دوسرے دروازے سے باہر چلی گئی اور حمید بوکھلا کر برآمدے میں نکل آیا. وہ اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا.

جاسوسی دنیا ناول نمبر 21 - شاہی نقارہ

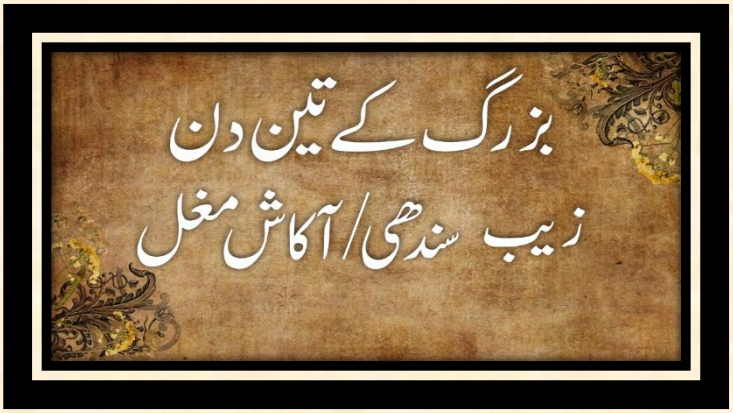

پہلا دن:

بھٹ شاہ میں شاہ لطیف سائیں کے مرقد پر رسم چادر پوشی کی ادائیگی کے بعد حاکمِ وقت نے فوٹو گرافروں اور ٹی وی چینلز کے کیمروں کی طرف دیکھ کر دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو اس لمحے وہ نورانی صورت بزرگ بھی وہاں موجود تھا۔ بزرگ نے حیرت سے حکم ران کی طرف دیکھا اور اس کی دعا ختم ہونے سے پہلے ہی باہر نکل آیا، مرقد کے باہر صحن میں درگاہ کے زائرین کے بجائے پولیس کے مسلح دستے دیکھ کر بزرگ کی حیرانی برہمی میں تبدیل ہوگئی۔ وہ پیچ و تاب کھاتا ہوا درگاہ سے باہر نکل گیا۔

وہ بزرگ بھٹ شاہ کا ہی رَہائشی تھا مگر اسی شہر میں رہنے کے باوجود عمر رسیدہ شخص نے آج تک لطیف سرکار کے مزار پر ہر سال منعقد ہونے والا میلہ گھوم کر نہیں دیکھا تھا، یہ پہلا موقع تھا جب وہ زندگی میں پہلی بار سندھ کے سرتاج صوفی شاعر لطیف سائیں کا میلہ دیکھنے نکلا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ میلے کے تینوں ایام، خوب گھوم پھر کر وہاں ہونے والی تمام سرگرمیوں کا بغور تفصیلی مشاہدہ کرے گا۔

درگاہ کی بیرونی گلی میں موجود تمام دکانیں بند تھیں اور مزار کے احاطے کی طرح گلی میں بھی ہر جگہ فقط پولیس و رینجرز کے باوردی اہل کاروں کے دستے دکھائی دے رہے تھے جو ہاتھوں میں آتشیں ہتھیار اور ڈنڈے تھامے چوکس کھڑے نظر آرہے تھے۔ گلی میں ایک جانب بڑی بڑی مہنگی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بزرگ کی نگاہیں دور دراز سے درگاہ پر آنے والے زائرین کی متلاشی تھیں مگر ان کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔

بزرگ اچنبھے میں پڑ گیا۔۔۔ ناگاہ تیز آواز میں بجنے والی وصل سے تمام اہل کار ہائی الرٹ ہوگئے، اسی لمحے مسلح پہرے داروں کے حصار میں بھاری پروٹوکول کے ساتھ حاکمِ وقت درگاہ سے باہر نکل کر اپنی سرکاری جھنڈے والی گاڑی میں سوار ہو رہا تھا۔

پل بھر میں سارا علاقہ حفاظتی دستوں اور پروٹوکول کی گاڑیوں کے سائرن کے سماعت شکن آوازوں سے گونج اٹھا۔ حاکمِ وقت سمیت وزراء، مشیران اور دیگر حکومتی انتظامہ پر مشتمل گاڑیوں کا قافلہ اپنے پیچھے دھول اڑاتا، تیزی سے روانہ ہو گیا۔

بزرگ اب گلی میں تنہا کھڑا تھا۔ اس نے اطمینان سے گہرا سانس لیا۔ اچانک مختلف گلیوں سے ہزاروں زائرین کا ریلا نمودار ہوا اور تیزی سے دوڑتا ہوا درگاہ کی مرکزی گلی میں داخل ہو گیا۔ ہجوم کی بھیڑ دیکھ کر بزرگ جلدی سے گلی کے ایک کونے میں سمٹ کر کھڑا ہو گیا مگر اس کے باوجود وہ اس انبوہ کثیر میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ ہر طرف عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ اسی اثناء میں دکانیں اور ہوٹل بھی کھلنے لگے۔ اس ہنگامہء بلاخیز میں گھٹن کے باعث بزرگ کا دم گھٹنے لگا، وہ بڑی مشکل سے پسینے میں شرابور، بے دم سا ہو کر بدقت تمام اس اژدہام سے باہر نکلا اور سامنے چوراہے پر پہنچ کر دم لیا۔

چوراہے کے وسط میں وسیع چبوترے پر بہت بڑا طنبورا نصب تھا جس کے گرد موجود آہنی جنگلے کے اطراف مختلف سیاسی جماعتوں کے رنگ برنگے جھنڈے، حکمرانوں کے لیے خیر مقدمی بینرز، سیاسی رہنماؤں اور وڈیروں کی تصاویر والے پینافلیکس اور بے شمار پھٹے پرانے کاغذی پوسٹر لہراتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ اس آپم دھاپ کے بیچ کھڑے بزرگ نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک دکان کے سامنے لوگوں کا ایک جم غفیر موجود تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ بزرگ شخص حیرت اور تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس دکان کی طرف بڑھا۔ کافی جدوجہد کے بعد وہ دکان کے آگے جمگھٹا لگائے لوگوں کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا، وہ کوئی ہوٹل تھا۔

ہوٹل میں نوخیز خوش شکل " ناچو)"رقاص لڑکے) کسی بے ہودہ بول والے بے ہنگم گیت کی موسیقی پر تھرک رہے تھے اور اندر بیٹھے شوقین مزاج تماش بینوں کا ہجوم ان خوبرو لڑکوں پر نوٹ نچھاور کر رہا تھا۔ بزرگ شخص کے دل میں نفرت اور کرودھ کا الاؤ دہکا اور وہ تیزی سے ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

سڑک پر ہجوم کے درمیان چلتے ہوئے بزرگ نے ایک جانب دیکھا جہاں راستے کے ایک طرف طبلے کی تھاپ پر چند خواجہ سرا ناچ رہے تھے۔ بزرگ مزید دل شکستہ و کبیدہ خاطر ہو گیا۔ اس نے افسردہ دلی سے سوچا، یہ کیسے زائرین ہیں... یہاں تو سب تماش بین اکٹھے ہو گئے ہیں۔۔۔ !

بزرگ شخص نے تماش بینوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے خود کو بہت دل گرفتہ محسوس کیا، رنج و غم کی کیفیت میں اس نے شاہ لطیف کے نام سے موسوم "شاہ باغ "کی طرف جانے کا ارادہ کیا، کیوں کہ اس باغ کے ساتھ اس کی بے شمار خوبصورت یادیں وابستہ تھیں.

شاہ باغ کی طرف چلتے ہوئے اس کی نظریں" کراڑ جھیل "کے کائی زَدہ گدلے پانی پر پڑیں تو اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر تماش بین ہجوم کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ کراڑ جھیل کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکلی اور بیت کا مصرعہ لبوں پر آ گیا:

اَ·و آبُ اُ·ُ°ہِوَ، °ہالو°ہِوَ°ہنگَنِ،

ایندا اَ·مَرَنِ، تَنھِن سَرَ·يِ ھَنجَ· ا.

(آج کل یہاں ہنس نہیں آتے. افسوس کہ کوے اور چڑیاں یہاں چھا گئے ہیں۔ جھیل کا پانی، جو کبھی بالکل صاف و شفاف ہوتا تھا، اب دھول مٹی سے گدلا ہو گیا ہے)

اس نے اپنے وجود میں افسردگی اور ملال کی کیفیت محسوس کی۔ وہ چند گھڑیاں کراڑ کے گدلے پانی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے من کی آزردگی بڑھتی رہی۔ چند لمحوں بعد جب اس نے کراڑ کے پانی سے نظریں ہٹائیں تو جھیل کے کنارے مدفون شاعر کی قبر پر پڑی، سنگ مرمر کی قبر کی طرف دیکھتے ہوئے بزرگ شخص کے چہرے پر ایک آسود مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ آگے بڑھ گیا۔

بزرگ شخص شاہ باغ کے قریب پہنچا تو وہاں ڈنڈا بردار وردی پوش سرکاری اہل کار راستے مسدود کیے کھڑے تھے۔ ایک سرکاری اہل کار لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے وہاں موجود لوگوں سے مخاطب تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر بار بار سرکاری طور پر اعلان کیا جا رہا تھا :

"موجودہ حکومت نے شاہ باغ میں شاندار ثقافتی گاؤں قائم کیا ہے جس کا افتتاح وزیر صاحب اپنے دست مبارک سے فرمائیں گے۔ جس کے بعد وہ عوام الناس کے لیے کھول دیا جائے گا۔ عوام سے پرزور التماس ہے کہ وزیر صاحب کی آمد کا انتظار کریں اور ان کی آمد پر ان کا والہانہ استقبال کریں" !

اعلان سن کر بزرگ شخص کے چہرے پر سخت ناپسندیدگی کے تاثرات ابھر آئے اور وہ وہاں سے واپس چلا گیا۔

***

دوسرا دن:

بزرگ شخص جب شاہ لطیف عالمی ادبی کانفرنس کا مشاہدہ کرنے ایکسی لینس سینٹر پہنچا تو اسے سینٹر کے لان میں کافی افراد کھڑے دکھائی دیے جو ٹولیوں کی صورت میں کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بزرگ کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید کانفرنس ہال شرکاء سے مکمل طور پر بھر چکا ہے اور ہال میں مزید لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش باقی نہیں رہی جس کے باعث لوگ مجبوراً باہر کھڑے ہیں۔

اسے ایک خیال یہ بھی آیا کہ ہو سکتا ہے، ادبی کانفرنس کا افتتاح بھی کسی وزیر کے ہاتھوں ہونا ہو اور ممکن ہے ہال کے باہر کھڑے لوگ وزیر موصوف کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں !

بزرگ شخص کے لیے ایسے کیسی بھی شخص کا انتظار ناممکنات میں سے تھا۔ لہٰذا اس نے واپسی کا قصد کیا مگر جب ہال کے اندر سے آنے والی آواز کی گونج اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ ایکسی لنس سینٹر کے ہال کی طرف بڑھ گیا.

ایکسی لنس سینٹر کے مرکزی دروازے کے سامنے چند پولیس اہل کار اور سرکاری محکمے کے کچھ نچلے درجے کے ملازمین کھڑے تھے۔ وہ کسی کو اندر جانے سے نہیں روک رہے تھے کیوں کہ ایسے موقع پر وہ ادیبوں اور شاعروں کے کسی ممکنہ احتجاج سے خالف تھے۔ پولیس والے ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔ سرکاری محکمہ کے چھوٹے ملازمین قیمتی لباس میں آنے والوں کو آگے بڑھ کر سلام کر رہے تھے جب کہ سادہ اور عام سے لباس والوں کو دیکھ کر بے زاری سے منہ پھیر لیتے تھے۔

بزرگ شخص وہاں پہنچا تو پولیس والے اس مخمصے کا شکار ہو گئے کہ اس شخص کو سلام کریں یا اس سے منہ پھیریں! چھوٹے ملازمین ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ بزرگ شخص ان کے برابر سے گزر کر ہال میں داخل ہو گیا۔

اندر راہداری میں سرکاری محکمہ کے متوسط درجے کے اہل کار کھڑے تھے جو قیمتی لباس والوں سے ہاتھ ملا کر ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے انہیں آگے والے دروازے کی طرف بھیج رہے تھے جب کہ سادہ عام لباس والوں کو دور سے ہی اشارے کر کے پچھلے دروازے کی طرف ہانک رہے تھے۔ بزرگ کا راہداری میں بھی بیرونی دروازے جیسا استقبال ہوا۔ اسے نہ تو کسی نے پچھلے دروازے کی طرف جانے کا کہا اور نہ ہی کسی متوسط درجے کے اہل کار نے ہاتھ ملا کر اگلے دروازے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ بزرگ خاموشی سے اگلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

ہال میں داخل ہوتے ہی بزرگ شخص کو تعجب نے آن گھیرا کہ ہال کی بیشتر کرسیاں خالی پڑی تھیں. ہال میں موجود شرکاء سے زیادہ لوگ تو باہر ٹولیوں کی صورت میں منڈلی جمائے کھڑے تھے۔ !

بزرگ شخص جا کر پہلی صف میں رکھے ہوئے ایک صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے قریب قیمتی لباس میں ملبوس شخص نے حیرت سے بزرگ شخص کی طرف دیکھا، پھر اپنا منہ پھر لیا۔

بزرگ شخص نے اسٹیج کی طرف دیکھا، اسٹیج پر ایک وزیر اور سرکاری محکموں کے اعلیٰ افسران سمیت درجن بھر ملکی و غیر ملکی اسکالر اور ادیب براجمان تھے. ایک اسکالر تقریر کر رہا تھا لیکن اسٹیج پر موجود مہمانوں سمیت ہال کے شرکاء اس کی تقریر سے بے نیاز باہمی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کسی کو اسکالر کی تقریر سے کوئی غرض نہ تھی۔!

بزرگ شخص کو شرکائے محفل کے رویے پر بہت افسوس ہوا۔ اس نے لوگوں کے رویے سے صرف نظر کرتے ہوئے غور سے اس اسکالر کی تقریر سننا شروع کی۔ وہ اسکالر کافی دیر تقریر کرتا رہا مگر اس کے خزینہ علم میں سے کوئی گنجینہء گوہر بر آمد ہوا اور نہ اس کی تقریر کا کوئی مقصد اور مفہوم واضح ہو سکا۔

اسکالر صاحب کے بعد بھی کئی عالم فاضل، مفکر، دانش ور، ماہر لطیفیات اور علامہ اسٹیج پر آئے اور طویل تقریریں جھاڑیں مگر سب لایعنی اور مفہوم سے عاری!، وقت گزرتا رہا، اکتا دینے والی بے سروپا تقریریں سامعین کے درد سر میں اضافہ کرتی رہیں۔ ہال سمیت اسٹیج پر براجمان مہمانوں میں بے چینی بڑھتی رہی اور بزرگ شخص چپ سادھے ارد گرد کا مشاہدہ کرتا رہا۔

ہال میں بٹھیے ہوئے عالموں کی تقاریر کا سلسلہ اختتام پذیر ہوا" تو شاہ لطیف عالمی ادبی کانفرنس " کے اسٹیج پر موجود ملکی و غیر ملکی ادباء، دانش وران، علماء و فضلاء کی باری آنی۔ بزرگ شخص نے اپنی پوری توجہ ان کی تقاریر کی طرف مبذول کر لی، وہ اس امید پر کامل یکسوئی کے ساتھ تقاریر سن رہا تھا کہ یہ عالی دماغ ضرور علم وادب اور حکمت کے موتی بکھیریں گے مگر۔۔۔ وہی ڈھاک کے تین پات! شام تک سامعین کے سر درد میں اضافہ کرتی بے مقصد و لایعنی تقریریں سننے والوں کا ضبط آزماتی رہیں اور اکتاہٹ کے شکار سامعین بھوک سے نڈھال بے چینی سے پہلو پر پہلو بدلتے رہے۔ بزرگ شخص کو محسوس ہوا کہ دانشوری کے نام پر ایک سے بڑھ کر ایک جہالت کا امام اسٹیج کی بے توقیری میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے صورت حال کا مشاہدہ کرتا رہا .

آخر کار جب وزیر صاحب کو ادبی کانفرنس کی تقریب کے صدارتی خطاب کے لیے ڈائس پر آنے کی دعوت دی گئی تو اچانک لوگوں کا جم غفیر باہر سے دھکم پیل کرتا ہال میں داخل ہو گیا۔ ہال سے باہر کھڑے تمام لوگ ہال میں پہنچ گئے۔ ہال کی تمام کرسیاں بھر گئیں کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ بے شمار لوگ ہال کے دروازوں میں پھنس کر کھڑے ہوئے تھے جب کہ مزید خلقت ہال میں داخل ہونے کے لیے دھینگا مشتی کر رہی تھی مگر ہال میں مزید گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو اندر داخل ہونے میں شدید دشواری پیش آ رہی تھی۔

وزیر صاحب کے لیے عوام کی اس قدر چاہت دیکھ کر بزرگ شخص دم بخود رہ گیا۔ اس نے سوچا، ہو نہ ہو یہ وزیر خلق خدا کا حقیقی مددگار اور سچا رفیق ہے جس کا خطاب سننے کے لیے جمہور صبح سے شام ہونے تک انتظار کی صلیب پر لٹکے ہوئی تھی۔ وزیر موصوف ڈائس پر آئے اور بساط بھر فہم کے مطابق

باعث مختصر خطاب کر کے اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔ اچانک ہال میں ایک بار پھر طوفانِ بد تمیزی بپا ہو گیا۔ عقد کھلا کہ اس ہلڑ بازی کا اصل منبع وہ اعلان تھا جس میں شرکاء محفل کو کھانا کھلنے کی نوید سنائی گئی تھی۔ کھانا کھلنے کا" طبل شادمانی "بجنے کی دیر تھی کہ سارے دن کی اکتاہٹ ماری خلقت کے تن مردہ میں گویا جان پڑ گئی اور وہ سب ہال کے دوسری طرف کھلنے والے دروازے کی طرف، ایک دوسرے کو روندتے پھلانگتے، دھکم پیل کرتے ہوئے جھپٹ کر پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا کی عملی تصویر بنے، لہو گرم رکھنے کے بہانے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یوں لپکے جیسے انہیں ذرا دیر ہو گئی تو شاید دنیا میں آنے کا حقیقی مقصد ہی ختم ہو جائے گا۔ !اب بزرگ پر حقیقت آشکار ہوئی کہ یہ لوگ وزیر صاحب کے عقیدت مند یا ان کی تقریر سننے کے شائق نہیں، بلکہ کھانے کے لیے اتاولے ہوئے جا رہے تھے۔ بزرگ شخص ادب نوازوں کو اپنے سامنے سے بھاگتے دوڑتے دیکھ کر اپنے پیر سمیٹ کر بیٹھ گیا، وزیر صاحب کے ساتھ اسٹیج پر موجود علماء، ادباء اور دانش ور حضرات اسٹیج پر ہی کھانا لگائے جانے کا انتظار کرنے لگے۔ جب بزرگ شخص کے سامنے سے کھانے کے لیے تاریخی جدوجہد کرنے والے چلے گئے تو وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور خاموشی کے ساتھ چلتا ہال سے باہر نکل گیا.

***

تیسرا دن:

بزرگ شخص جب محفل موسیقی اور تقریب تقسیم ایوارڈ کا مشاہدہ کرنے شاہ عبداللطیف بھٹائی آڈیٹوریم کے سامنے پہنچا تو وہاں عوام کا بے پناہ ہجوم تھا۔ کئی ڈنڈا بردار باوردی پولیس اہل کار ہجوم کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ ان کے عقب میں ذرا فاصلے پر پولیس کے درمیانے درجے کے ملازمین سمیت اعلیٰ افسران بھی موجود تھے۔ آڈیٹوریم میں فقط ان لوگوں کو اندر جانے کی اجازت دی جارہی تھی جن کے پاس تقریب کے حوالے سے جاری کیا گیا خصوصی کارڈ موجود تھا، بزرگ کو چونکہ ہر صورت تین روزہ میلے کا مشاہدہ کرنا تھا چنانچہ وہ لوگوں کی بھیڑ کے بیچ میں سے راستہ بناتا آگے بڑھتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں خصوصی کارڈ نہ ہونے کے باوجود سپاہیوں نے اس کا راستہ نہ روکا، اس پر پولیس کے کسی ادنیٰ یا اعلیٰ افسر کی نظر نہیں پڑی لہٰذا وہ بغیر کسی روک ٹوک کے اندر داخل ہو گیا۔

آڈیٹوریم کے اسٹیج پر تیز روشنیوں کی چکاچوند میں بھڑکیلا اور چست لباس پہنے، ہاتھ میں مائک تھامے کوئی خوش شکل نوجوان گلوکارہ گانے کے ساتھ اپنے جسم کو بھی خوب لچکا مٹکا رہی تھی۔ خوبصورت گلوکارہ کے چاروں طرف بہت سے نوجوان لڑکے بندروں کی طرح اچھل کود کرنے کے ساتھ دانتوں کی نمائش بھی کر رہے تھے۔

بزرگ شخص خاموشی سے آڈیٹوریم میں بیٹھے لوگوں کی پہلی صف کی طرف بڑھا، پہلی صف میں حاکم وقت، چند وزراء، مشیر اور اعلیٰ سرکاری افسران اپنی اپنی نشستوں پر براجمان تھے۔ اسی صف میں چند کرسیاں خالی بھی تھیں لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ ان خالی کرسیوں پر بیٹھ سکے کیوں کہ حکم رانوں طبقے کے لیے مخصوص اس خصوصی حصے کے ارگرد خفیہ اداروں کے باوردی اور سادہ لباس میں ملبوس بے شمار اہل کار باادب باملاحظہ ہوشیار کی عملی تصویر بنے مستعد حالت میں موجود تھے۔ بزرگ شخص پہلی قطار والی کرسیوں کی طرف بڑھا تو ان باادب باملاحظہ ہوشیار اہل کاروں کے سیکیورٹی انتظامات کی قلعی اس وقت کھل گئی جب بزرگ شخص حکم رانوں سے ذرا فاصلے پر ایک خالی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا !...

بزرگ نے کرسی پر بیٹھتے ہی اپنی آنکھیں بند کر لیں کیونکہ وہ اسٹیج پر بے ہودہ انداز میں چٹکتی مٹکتی گلوکارہ اور اس کے اطراف بندروں کی طرح اچھل کود کرتے نوجوانوں کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جسم لچکاتی گلوکارہ کے بعد اور مزید کئی گلوکار اسٹیج پر آئے جو گانے سے پہلے اپنی منہ میاں مٹھو کے مصداق اپنی شان میں خود ستائشی کلمات ادا کر کے بڑے راگ الاپتے اور گانے کے بیچ میں حاضرین کو داد کے طور پر تالیاں بجانے کی اپیلیں بھی کرتے رہے۔ بزرگ شخص حیرت زدہ تھا کہ شاہ لطیف کے نام پر ہونے والی محفل موسیقی میں گلوکار شاہ لطیف کی شاعری۔

***

خواتین
کے عالمی دن
کے خصوصی
مضامین

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

امی وہ سنائیں " بولیں اماں محمد علی کی "۔۔۔امی سانس لینے کے لئے رکی ہی تھیں کہ میں نے دوسری فرمائش داغ دی۔

یہ سردیوں کی راتیں تھیں لالٹین کی مدھم روشنی میں ہم سب لحافوں میں دبکے مونگ پھلی ٹھونگ رہے تھے۔ میں اور باجی جاگ رہے تھے۔ دو چھوٹے بہن بھائی سو رہے تھے (سب سے چھوٹی ابھی اس دنیا میں نہیں آئی تھی)۔ امی ہمیں اپنی سریلی آواز میں جواب شکوہ کے یہ اشعار سناتیں۔ مجھے یہ چند شعر تو تیسری جماعت میں ہی یاد ہو گئے تھے۔

"اچھا وہ۔۔۔لو سنو "

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
تمہی ہو میرے گھر کا اجالا
تھا اسی واسطے تم کو پالا
کام کوئی نہیں اس سے اعلا

جان بیٹا خلافت پہ دے دو

پتہ نہیں یہ کون سی طرز تھی کہ ہماری آنکھیں نم ہوتی جاتی تھیں۔ ہم نہ محمد علی کو جانتے تھے نہ شوکت علی کو۔ نہ ہی یہ پتا تھا کہ خلافت کیا (یا کون) ہوتی ہے۔ بہت بعد میں ایک دن رفیع صاحب کا گانا کہیں ریڈیو پر سنا " رات بھر کا ہے مہمان اندھیرا۔۔ کس کے روکے رکا ہے سویرا "۔۔ اس گانے کی دھن پر شاید امی ہمیں سناتی تھیں۔"۔ بولیں اماں محمد علی کی "

سردیوں کی ان راتوں میں امی نہ صرف ہمیں کہانیاں، لوریاں سناتیں بلکہ اپنے بچپن کے قصے بھی سناتیں۔ میری امی اللہ بخشے، جو صرف چار جماعت پڑھی تھیں۔ خود بھی کتابیں پڑھنے کی شوقین تھیں اور شاندار یادداشت رکھتی تھیں، ہمیں دنیا جہاں کی باتیں بتاتیں،

"جب جرمن اور بلٹس (برٹش) کی لڑائی لگی"

"بلٹس کے زمانے میں روپے کا چار سیر آٹا ملتا تھا"

"جب ماشلّا (مارشل لا) لگا تو ایوب خان نے پانی ملے دودھ کے ڈرم نالیوں میں بہا دیئے۔ ایسی سختی تھی "

ہمیں کچھ سمجھ نہ آتا لیکن مزہ آتا تھا یہ سب سننے میں۔ داستان طرازی کی یہ عادت شاید مجھے امّی سے ہی ملی ہے.

پھر ایک دن جنگ اخبار کے پہلے پورے صفحے پر مولانا محمد علی جوہر کی پوری رنگین تصویر تھی جن کا اس دن یوم پیدائش یا یوم وفات تھا۔ اندرونی صفحات پر مولانا کے بارے میں مضامین تھے اور ایک تصویر مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور بی اماں کی تھی۔

یہ تب کی بات ہے جب جنگ اور انجام اخبار میں کبھی قائد اعظم، تو کبھی لیاقت علی، تو کبھی ایوب خان، یا سردار نشتر، یا نواب بہادر یار جنگ کی بڑی بڑی رنگین تصویریں لگا کرتیں جنہیں، ظہور الاخلاق، بنایا کرتے تھے۔ (یہی ظہور الاخلاق تھے جو کبھی ابن صفی کے ناولوں کے ٹائٹل بھی بنایا کرتے تھے)۔

ان اخبارات کی مہربانی تھی کہ ہمیں بچپن میں ہی اکابرین کے بارے میں تھوڑی بہت سن گن مل جایا کرتی تھی۔

"امی یہی ہیں وہ، بولیں اماں محمد علی، والی؟"

"ارے ہاں، وہی تو ہیں۔ محمد علی، شوکت علی کی اماں"۔ امی کی آنکھوں میں عقیدت کی چمک تھی۔ کچھ دیر تصویر دیکھتی رہیں پھر باورچی خانے کی طرف چل دیں۔ امی پھر گنگنا رہی تھیں " بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو"۔

اور تب سے بی اماں کا ایسا پاکیزہ تصور ذہن کے پردے پر قائم ہوا کہ آج بھی ان کا ذکر آتا ہے تو نظریں احترام اور عقیدت سے جھکتی چلی جاتی ہیں۔ بچے اور خاص کر بیٹے تو ماؤں کی جان ہوتے ہیں۔ ان کے جگر کے ٹکڑے، مائیں جن کی سلامتی کے لئے دن رات دعائیں کرتی ہیں۔ اور یہ بڑی بی اپنے بچوں کو خلافت کے لئے جان دینے کو کہہ رہی ہیں۔ خلافت جو ان کے نزدیک اللہ کی امانت ہے۔ جسے وہ اسلام کی نشات ثانیہ کی ضامن سمجھتی تھیں۔ اور ایسی ماں نے پوت بھی جنمے تو کیسے۔

شوکت علی، محمد علی، یا علی برادران، تحریک آزادی اور تحریک خلافت کے صف اوّل کے سپاہی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ایک، جامعہ ملیہ دہلی جیسی درسگاہ کے موسس۔ مولانا محمد علی جوہر، " اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد "جیسے شعر کے خالق۔بی اماں نے جن کی تربیت ایسی کی کہ کہہ اٹھے۔

"توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لئے ہے۔

اپنی اولاد کو بھی اپنی ہی طرح تسلیم و رضا کا پیکر ایسا بنایا کہ محمد علی کی جواں سال بیٹی بستر مرگ پر ہے۔ محمد علی انگریز کی قید کاٹ رہے ہیں۔ بیٹی کے بچنے کی امید ختم ہوتی جارہی ہے اور زنداں سے اپنی جگر گوشہ کو لکھتے ہیں

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو

نہیں منظور تو ہم کو بھی منظور نہیں۔

محمد علی، میرے کراچی کے خالقدناہال میں ان پر مقدمہ چل رہا ہے۔ سزا ہو جاتی ہے۔ آزادی کا یہ مجرم میرے شہر کی سنٹرل جیل میں مقید ہو جاتا ہے۔ انگریز اس کی قابلیت جانتا ہے، آکسفورڈ کا تعلیمیافتہ، کامریڈ اخبار کا بانی، کوئی عام ہندوستانی نہیں ہے۔ محمد علی کو معافی کی پیشکش ہوتی ہے۔ جسے وہ ٹھکرا دیتے ہیں۔ماں کو خبر ملتی ہے۔ ذرا آج کے رہنماؤں کا تصور کریں جو ثابت شدہ جرم کے باوجود ضمانت، خرابی صحت کے بہانے اور نہ جانے کس کس طرح کے بہانے سے رہائی چاہتے ہیں۔ اور ذرا بی اماں کو دیکھیں۔ اطمینان سے خبر سنتی ہیں اور بڑے عزم سے کہتی ہیں " محمد علی اسلام کا بیٹا ہے۔ وہ معافی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو میرے بوڑھے ہاتھوں میں اس کا گلا گھونٹ دینے کی طاقت اب بھی ہے"۔

اور یہی بی اماں حج کے لئے جاتی ہیں تو کعبہ کا غلاف پکڑ کر التجا کرتی ہیں کہ " مالک، تیرے کرم سے میرے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ میں تجھ سے دعا کرتی ہوں کہ انہیں سچا مسلمان بنا"۔

آبادی بانو بیگم (یا عبادی بانو بیگم) یعنی بی اماں نے آنکھ آزاد ہندوستان میں کھولی تھی۔ یہ ۱۸۵۰ کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ کم سنی میں ہی ہندوستان کو غلام ہوتے دیکھا۔ ایک غیر تمند گھرانے کی بیٹی جس کے ستر سالہ چچا کو انگریز نے بغاوت کے الزام میں پھانسی دی تو انہوں نے آگے بڑھ کر پھانسی کا پھندا خود اپنے گلے میں ڈال لیا۔ غدر کے ہنگاموں میں ہوش سنبھالنے والی آبادی بیگم نے حریت اور آزادی کی لو کو اپنے سینے میں کبھی مدھم نہ ہونے دیا۔ یہ تپش اور یہ تڑپ انہوں نے اپنے بیٹوں کے سینوں میں بھی جلائے رکھی۔ تسلیم و رضا تو جیسے گھٹی میں پڑی تھی۔ سب سے بڑے بیٹے نوازش علی کی موت پر لوگ پرسہ دینے آئے تو بڑی بہادری سے تعزیت کرنے والوں کو سمجھاتی ہیں کہ ہمیں اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکانا ہے۔ یہ اس کے اختیار میں ہے کہ جو کچھ دیتا ہے، واپس بھی لے سکتا ہے۔ اس کی امانت تھی، اس نے واپس لے لی، شکایت کیسی؟۔

جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو محمد علی صرف دو سال کے تھے۔ بی اماں نے واجبی سی گھریلو تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس زمانے کے رواج کے خلاف شوکت علی اور محمد علی کو انگریزی تعلیم دلوائی۔ شوکت علی نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے کسب علم کیا تو محمد علی نے آکسفورڈ کی راہ لی۔ اور یہ بی اماں پہلی مسلم خاتون تھیں جنہوں نے عملی سیاست میں حصہ لیا، کبھی مسلم لیگ کے جلسوں سے خطاب کیا تو کبھی خلافت کمیٹی تو کبھی عدم تعاون کی تحریک، کبھی چندہ جمع کر رہی ہیں تو کہیں کسی رہنما کی رہائی کے لئے تحریک چلا رہی ہیں، ہندوستان کے گاؤں اور شہروں کے دورے کر رہی ہیں۔ ساری عمر پردہ کیا۔ اسی پردے میں لاہور میں ایک ایسی تقریر کی کہ ادب کا شاہکار قرار پائی۔ گاندھی جی خود کو بی اماں کا تیسرا بیٹا کہتے تھے۔ گاندھی جی اور علی برادران جیل چلے گئے تو بی اماں نے بیگم حسرت موہانی، بسنتی دیوی، سرلا دیوی چوہدرانی اور سروجنی نائیڈو کے ساتھ مل کر آزادی کا پرچم بلند رکھا۔ بی اماں نے اپنے بچوں کو سادہ غذا، سادہ لباس اور اسلام کے اعلا اصولوں کی تربیت کے ساتھ بڑا کیا تھا۔ عدم تعاون کی تحریک میں یہی تعلیم ہندوستانی خواتین کو دیتی رہیں اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک کے ہراول دستہ میں شامل رہیں۔ خود صوم وصلوات کی پابند تھیں لیکن ہندو مسلم اتحاد کے لئے دن رات کام کرتیں کہ یہ آزادی کی بنیادی ضرورت تھی۔ اصل چیز دنیا سے بے نیازی اور آخرت کی کامیابی ان کے پیش نظر رہتی۔ اور ایسی کیا چیز تھی جو انہیں آخرت میں سرخرو نہ کرتی۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ روز حشر جزا و سزا کے فیصلے کرتے ہوئے اللہ انسانوں کی گواہی کو ضرور سنتا ہو گا اور بی اماں جیسوں کے لئے سوائے کلمہ خیر کے اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نَورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

8 مارچ، عالمی یومِ خواتین، ایک ایسا دن جو دنیا بھر میں خواتین کے حقوق، ان کی قربانیوں اور جدوجہد کو تسلیم کرنے کے لیے منایا جاتا ہے۔ لیکن کیا واقعی یہ دن اپنی اصل روح کے ساتھ منایا جا رہا ہے، یا پھر اسے ایک تجارتی میلے میں بدل دیا گیا ہے؟

ہر سال، اس دن کو شدید جوش و خروش سے منایا جاتا ہے، مگر اکثر یہ جوش صرف خواتین کو لبھانے والے اشتہارات، برانڈنگ، رعایتی پیشکشوں اور سماجی میڈیا پر وائرل ہونے والے نعروں تک محدود رہتا ہے۔ ہر چیز کو گلابی رنگ میں رنگ کر، چاکلیٹ اور گلدستوں میں لپیٹ کر، خواتین کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ بس یہی خوشی اور یہی آزادی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی تمام قربانیاں، ان کی جدوجہد اور ان کے حقیقی مسائل پسِ پشت چلے گئے ہیں، اور انہیں خوابوں کی ایک مصنوعی دنیا میں قید کر دیا گیا ہے—جہاں شیشے کے محلات، بادلوں کی سرزمین، اور سفید گھوڑے پر سوار شہزادے ہی ان کی اصل خواہشات قرار دی جاتی ہیں۔

یہ وہی خواتین ہیں جو سال کے باقی دنوں میں اپنی زندگی، سماجی حیثیت اور حقوق کی عدم دستیابی پر شکوہ کناں رہتی ہیں، لیکن یومِ خواتین پر چند خوشنما الفاظ، رسمی تقریبات، اور مارکیٹنگ کی چمک دمک سے خود کو مطمئن کر لیتی ہیں۔ کیا یہی آزادی ہے؟ کیا یہی وہ حقوق ہیں جن کے لیے صدیوں تک خواتین نے جدوجہد کی تھی؟

یومِ خواتین: تاریخ اور پس منظر

یہ دن کسی جدید برانڈنگ مہم کا حصہ نہیں، بلکہ اس کی جڑیں ایک گہری تاریخی جدوجہد میں پیوست ہیں۔ 8 مارچ 1917 کو روس میں خواتین نے روٹی، بہتر حالاتِ کار اور مساوی حقوق کے لیے مظاہرے کیے تھے، جو آگے چل کر روسی انقلاب کا نقطۂ آغاز بنے۔ یہ دن دراصل خواتین کی اس اجتماعی جدوجہد کی یاد دلاتا ہے، جو انہیں سیاسی، سماجی اور معاشی مساوات دلانے کے لیے کی گئی تھی۔

اگر ہم مزید پیچھے جائیں، تو 1893 میں نیوزی لینڈ وہ پہلا خود مختار ملک تھا، جس نے خواتین کو ووٹ ڈالنے کا حق دیا۔ 1920 میں، مصر کی " سوسائٹی آف فزیشنز "نے خواتین کے جسمانی اعضاء کے مسخ کیے جانے کے خلاف ایک مضبوط مہم چلائی، جو خواتین کے بنیادی حقوق کے تحفظ میں ایک بڑی کامیابی تھی۔

اصل سوال: یومِ خواتین کا حقیقی مقصد کیا ہے؟

کیا آج بھی خواتین کے مسائل وہی ہیں جو صدیوں پہلے تھے؟ کیا ہم آج بھی ان کے حقوق، ان کے تحفظ، ان کے مساوی مواقع، اور ان کے خلاف ہونے والی ناانصافیوں کے بارے میں اسی شدت سے بات کر رہے ہیں؟ یا پھر ہم نے اس دن کو ایک اور تجارتی موقع میں بدل دیا ہے؟

یومِ خواتین صرف گلابی رنگ، گفٹ، رعایتی آفرز، یا سوشل میڈیا پر دلکش پیغامات کا نام نہیں۔ یہ ایک یاد دہانی ہے کہ خواتین کو حقیقی معنوں میں مساوی حقوق حاصل کرنے کے لیے اب بھی ایک طویل سفر طے کرنا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس دن کو ایک میلے کے بجائے ایک سنجیدہ موقع کے طور پر دیکھیں، جہاں خواتین کے حقیقی مسائل، ان کے خواب، ان کی جدوجہد اور ان کے حقوق پر عملی کام کیا جائے، نہ کہ صرف رسمی نعروں اور اشتہارات تک محدود رہا جائے۔

یہ دن صرف خوشی منانے کا نہیں، بلکہ سوچنے، سوال کرنے اور آگے بڑھنے کا ہے—ایک ایسی دنیا کی طرف جہاں خواتین کو حقیقی معنوں میں آزادی، مساوی حقوق، اور عزت حاصل ہو۔

تو، کیا ہم واقعی یومِ خواتین کا مطلب سمجھ رہے ہیں؟ یا پھر ہم بس اس مصنوعی جشن کا حصہ بن چکے ہیں؟

بالکل! اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض خواتین بھی اس جشن کے دکھاوے میں برابر کی شریک ہیں۔ بہت سی خواتین جو خود ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کر سکتی ہیں، وہی سماج کی کھوکھلی روایات کو مضبوط کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔

یومِ خواتین پر بڑی بڑی تقریبات، سیمینار، اور گلاب کے پھولوں کی تقسیم تو نظر آتی ہے، لیکن کیا یہی اصل مسئلے کا حل ہے؟ خواتین کے حقوق کی بات کرنے والی کئی خواتین خود بھی ان رسومات میں شامل ہو جاتی ہیں، جو محض رسمی طور پر اس دن کو منا کر اپنی " ذمہ داری "پوری کر لیتی ہیں۔ وہ خود بھی اس نظام کا حصہ بن جاتی ہیں جو عورت کے حقیقی مسائل پر بات کرنے سے کتراتا ہے۔

ایسے میں اصل سوال یہ ہے کہ کیا خواتین کو خود اپنی ذات کے حصار سے باہر نکل کر اپنی حقیقی طاقت کو پہچاننا نہیں چاہیے؟ کیا انہیں صرف رسمی جشن کا حصہ بننے کے بجائے عملی طور پر جدوجہد نہیں کرنی چاہیے؟ یہ خوشنما نعروں اور گلابی رنگ کی تقریبات سے آگے بڑھ کر خود احتسابی کا وقت ہے۔ اگر خواتین واقعی تبدیلی چاہتی ہیں، تو انہیں سب سے پہلے اس نمائشی جشن کی حقیقت کو پہچاننا ہو گا اور ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہو گا، محض کسی ایک دن نہیں، بلکہ ہر دن، ہر محاذ پر۔

اگر ہندوستان کی تاریخ کے اوراق پلٹیں تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ یہاں صدیوں سے عورت مظلومیت، تشدد اور ناانصافی کا شکار رہی ہے۔ نسلی تعصب، ذات پات کا بھید بھاؤ، جہالت اور دقیانوسی روایات نے اسے ایک کمتر مخلوق کے درجے پر لا کھڑا کیا۔ تعلیم، حقوق، اور برابری سے محروم رکھا گیا، حتیٰ کہ بعض اوقات جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا گیا۔

مگر اسی سرزمین پر کچھ روشن چراغ بھی جلے، جنہوں نے اس تاریکی میں روشنی کی شمع جلانے کی ہمت کی۔ 1848 میں، ساوتری بائی پھولے نے فاطمہ شیخ اور ان کے بھائی عثمان شیخ کی مدد سے دبے کچلے طبقات کی عورتوں کے لیے تعلیم کے دروازے کھولے۔ فاطمہ شیخ نے اس مشن میں نہ صرف بھرپور ساتھ دیا بلکہ اپنا گھر بھی اس مقصد کے لیے وقف کر دیا تاکہ عورتیں علم کے نور سے منور ہو سکیں، اپنے حقوق سے آگاہ ہو سکیں۔ لیکن یہ راہ کانٹوں سے بھری تھی۔ انہیں گلیوں میں پتھر مارے گئے، سماج کی لعنتیں سننی پڑیں، مگر وہ نہ رکیں، نہ جھکیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان نے اپنی پہلی خاتون معلمہ کے طور پر ساوتری بائی پھولے اور پہلی مسلم خاتون معلمہ کے طور پر فاطمہ شیخ کا نام تاریخ میں رقم کیا۔

یہی بے باکی اور مزاحمت کا رنگ بیسویں صدی میں عصمت چغتائی کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ انہوں نے عورت کی جنسیت، متوسط طبقے کی گھٹن اور سماجی ناانصافیوں پر قلم اٹھایا۔ ان کے الفاظ گواہ ہیں کہ کس طرح انہوں نے ہر پابندی، ہر دھمکی اور ہر مقدمے کے باوجود سچ کو کاغذ پر اتارا۔ سماج نے انہیں طنز و تنقید کی صلیب پر لٹکایا، مگر وہ ڈریں نہیں۔ اسی قلم کی قیمت انہیں ایک طرف بدنامی کی صورت میں چکانی پڑی تو دوسری طرف حکومتِ ہند نے انہیں پدم شری سے نوازا۔

پھر وہ لمحہ بھی آیا جب کلپنا چاؤلہ نے خلا کی وسعتوں میں اپنی شناخت رقم کی۔ ایک ہندوستانی نژاد خاتون خلاباز کے طور پر، انہوں نے ثابت کیا کہ عورت کی بلند پروازی صرف خواب نہیں، حقیقت بھی ہے۔ ان کی خدمات نے عورت کے امکانات کو زمین سے آسمان تک پھیلا دیا، لیکن اس سفر میں انہوں نے اپنی جان کی قربانی بھی دے دی۔

مگر افسوس، کہ ہم ان قربانیوں کو بھول چکے ہیں۔ آج بھی عورت عدم تحفظ، جبر اور ظلم کی چکی میں پس رہی ہے۔ کبھی وہ اسپتال میں ایک معالج کے طور پر اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے درندگی کا شکار ہو جاتی ہے، تو کبھی پانچ سالہ معصوم اسکول جاتے ہوئے ہوس کا نشانہ بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تین ماہ کی ننھی کلی بھی اپنے ہی گھر میں درندگی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ اور یہ سب اس زمانے میں ہو رہا ہے جب ہم فخریہ انداز میں یومِ خواتین منا رہے ہیں! یہ کیسا جشن ہے؟ یہ کیسی خوشی ہے؟ جب عورت کی عزت کا خون ہر گلی، ہر شہر میں بہایا جا رہا ہو، جب اس کے خواب مسل دیے جائیں، اس کی آواز دبا دی جائے، اور اس کے وجود کو ہی کچل دیا جائے—تب صرف ایک دن اسے یاد کرنا، کیا اس کی توہین نہیں؟

میں اپنی بات پروفیسر، شاعر، ادیب غضنفر علی کی نظم کے ان مؤثر اشعار پر ختم کرتی ہوں، جو اس سماج کی کھوکھلی حقیقت پر آئینہ رکھتے ہیں:

تمہارا دن مناتے ہیں

غضنفر علی

چلو آؤ تمہارا دن مناتے ہیں
تمہاری ذات پر ایمان لاتے ہیں
تمہارے سامنے اقرار کرتے ہیں
کہ ہم نے مدتوں تک تم کو کچلا ہے
تمہیں مسلا ہے، روندا ہے
تمہیں لوٹا ہے، کوٹا ہے
تمہیں مارا ہے، پیٹا ہے
تمہیں نوچا، کھسوٹا ہے
تمہارے پاؤں میں زنجیر ڈالی ہے
تمہارے ہونٹ سی ڈالے
تمہاری سوچ کو مفلوج کر ڈالا
تمہاری عقل پر بھی رکھ دیے پتھر
تمہارے جذبۂ دل کو کچل ڈالا
مگر اب ہر سال تمہیں یاد کرتے ہیں
تمہارے نام پہ محفل سجاتے ہیں
تمہیں گل پیش کرتے ہیں
گلوں کی پتیوں سے نام لکھتے ہیں...
کیا یہی کافی ہے؟
کیا بس یہی کافی ہے؟

اداکارہ، شاعرہ،، گلوکارہ، کاسٹیوم ڈیزائنر۔۔۔۔۔

کسی بھی بچے کا پہلا سائبان اس کی ماں کی ممتا بھری ہوئی گود ہوتی ہے مگر مینا کماری کا پہلا سائبان بمبئی کا یتیم خانہ تھا۔

جی ہاں! اپنی سنجیدہ اداکاری سے ناظرین کے دلوں کو چھو لینے والی عظیم اداکارہ مینا کماری ممبئی میں یکم اگست 1932 کو ایک متوسط طبقے کے مسلم خاندان میں جب پیدا ہوئیں تو باپ علی بخش انہیں یتیم خانے چھوڑ آئے کیوں کہ 2 بیٹیوں کی پیدائش کے بعد وہ بیٹے کے لئے دعا گو تھے۔۔۔ تاہم کچھ ہی عرصے بعد انہیں اپنی بیوی کے آنسوؤں نے بچی کو یتیم خانے سے گھر لانے کے لئے مجبور کر دیا۔

اور پھر جس باپ نے مالی تنگ دستی کی وجہ سے مینا کو یتیم خانے پہنچایا تھا اسی نے ان کے وہ خواب پورے کیے جنہیں وہ ساری زندگی ہارمونیم کے سروں میں پروتے آئے تھے۔

مینا کماری کی ماں اقبال بانو نے ان کا نام " ماہ جبیں " رکھا۔ بچپن کے دنوں میں مینا کماری کی آنکھیں بہت چھوٹی تھیں اس لئے خاندان والے انہیں " چینی " کہہ کر بھی پکارا کرتے تھے۔

سن 1939ء میں چار سال کی عمر میں مینا کماری نے بطور چائلڈ آرٹسٹ فلموں میں اداکاری کرنی شروع کر دی تھی۔ پرکاش پکچرز کے بینر تلے بنی فلم "لیدر فیس" میں ان کا نام " بے بی مینا " رکھا گیا۔ اس کے بعد مینا نے " بچوں کا کھیل " میں بطور اداکارہ کام کیا۔ اسی فلم میں انہیں " مینا کماری " کا نام دیا گیا۔

یوں تو مینا کماری ہر طرح کے کردار میں خود کو ڈھال لیا کرتی تھیں لیکن جب وہ سنجیدہ کردار نبھاتیں تو وہ ایک مثال بن جایا کرتی تھیں۔ سنجیدہ اور درد میں ڈوبے کرداروں کو موثر طریقہ سے ادا کرنے کی صلاحیت نے انہیں سنیما کے آسمان کی ان بلندیوں تک پہنچا دیا۔

مینا کماری بہترین اداکارہ کے ساتھ ساتھ ایک اچھی شاعرہ بھی تھیں۔ ان کے کرداروں کی طرح ان کی شاعری میں بھی درد، بے چینی، تنہایوں، محرومیوں اور بے شمار تلخیوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔

مینا کماری کے قریبی دوست نے بتایا کہ ”مینا کماری کے والد ماسٹر علی بخش اور والدہ اقبال بیگم کے گھریلو حالات ناتواں تھے۔ باپ کو بیٹے کی خواہش تھی لیکن پیدا بیٹی ہوئی، اس لئے ماں کو مینا کماری سے خاص محبت نہیں تھی

مینا کماری کا بچپن محرومی میں گزرا۔ وہ دل بہلانے کے لئے اپنے آنگن سے پتھر اٹھا کر معروف موسیقار نوشاد صاحب کے گھر پر پھینک دیا کرتی تھیں۔ نوشاد صاحب کو بھی یہ علم نہ تھا کہ ان کے گھر پر پتھر پھینکنے والی بچی ایک دن بڑی اداکارہ بنے گی جس کے دنیا میں چرچے ہوں گے۔“

سن 1952 میں مینا کماری کو وجے بھٹ کی ہدایت میں فلم ”بیجو باورا“ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ فلم کی کامیابی کے بعد وہ بطور اداکارہ اپنی شناخت بنانے میں کامیاب رہیں۔

اسی سال انہوں نے فلم ساز کمال امروہی کے ساتھ شادی کر لی۔ اسی دوران انہوں نے کئی کامیاب فلمیں بھی دیں۔ میں چپ رہوں گی اور صاحب بیوی اور غلام“ جیسی فلمیں ان کے فلمی کیریئر کے لئے کامیاب ثابت ہوئی لیکن مزاج نہ ملنے کی وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی میں تلخی آگئی اور دونوں علیحدہ، علیحدہ رہنے لگے۔

کمال امروہی کی فلم ”پاکیزہ“ کو بننے میں تقریباً 14 برس لگ گئے۔ کمال امروہی سے الگ ہونے کے باوجود مینا کماری نے شوٹنگ جاری رکھی تھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ پاکیزہ جیسی فلموں میں کام کرنے کا موقع بار بار نہیں مل پاتا۔

بعد میں تاریخ نے ثابت کیا کہ مینا کماری کی یہ بات بالکل سچ ثابت ہوئی۔

بہترین اداکاری کے لئے انہیں چار بار فلم فیئر کے بہترین اداکارہ کے ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ ان میں ”بیجو باورا، پرینیتا، صاحب بیوی اور غلام اور ”کاجل“ شامل ہیں۔

اتنے دکھوں نے مینا کماری کو اندر سے کہیں توڑ دیا تھا۔ اس غم کو بھلانے کے لئے انہوں نے شراب نوشی شروع کر دی جو آہستہ آہستہ ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ شراب نوشی کے سبب انہیں موت نے مزید زندہ رہنے کا موقع نہیں دیا اور وہ 31 مارچ 1972 کو اس دنیا کو الوداع کہہ گئیں۔

مینا کماری اگر اداکارہ نہ ہوتیں تو شاعرہ کے طور پر اپنی شناخت بناتیں۔ ہندی فلموں کے نغمہ نگار اور شاعر گلزار سے ایک بار مینا کماری نے کہا تھا،” یہ جو اداکاری میں کرتی ہوں اس میں ایک کمی ہے۔ یہ فن، یہ آرٹ مجھ میں پیدا نہیں ہوا ہے، خیال دوسرے کا، کردار کسی کا اور ہدایت کسی کی۔ میرے اندر سے جو پیدا ہوا ہے، وہ میں لکھتی ہوں، جو میں کہنا چاہتی ہوں، وہ لکھتی ہوں۔“

مینا کماری نے اپنی وصیت میں اپنی نظمیں چھپوانے کا ذمہ گلزار کو دیا تھا جسے انہوں نے ” ناز “ تخلص سے چھپوایا۔

ہمیشہ تنہا رہنے والی مینا کماری نے اپنی ایک غزل میں اپنا ایک درد بیان کیا تھا۔

چاند تنہا ہے آسماں تنہا

دل ملا ہے کہاں کہاں تنہا

راہ دیکھا کرے گا صدیوں تک
چھوڑ جائیں گے یہ جہاں تنہا
مینا کماری ناز کی شاعری سے چند منتخب اشعار!!!!!
تھمی ہے ان آنکھوں میں یوں نمی کی طرح
چمک اٹھے ہیں اندھیرے بھی روشنی کی طرح

یوں تیری رہ گزر سے دیوانہ وار گزرے
کاندھے پہ اپنے رکھ کے اپنا مزار گزرے

آبلہ پا کوئی اس دشت میں آیا ہو گا
ورنہ آندھی میں دیا کس نے جلایا ہو گا

آغاز تو ہوتا ہے انجام نہیں ہوتا
جب میری کہانی میں وہ نام نہیں ہوتا

عیادت ہوتی جاتی ہے عبادت ہوتی جاتی ہے
مرے مرنے کی دیکھو سب کو عادت ہوتی جاتی ہے

چاند تنہا ہے آسماں تنہا
دل ملا ہے کہاں کہاں تنہا

یہ نہ سوچو کل کیا ہو
کون کہے اس پل کیا ہو

عیادت کو آئے شفا ہو گئی

میری روح تن سے جدا ہو گئ

آنکھوں کو دیکھتے ہی بولے
بن پیئے کوئ مدہوش آیا

کہیں کہیں کوئی تارہ کہیں کہیں جگنو
جو میری رات تھی وہ آپ کا سویرا ہے

جب چاہا اقرار کیا ہے جب چاہا انکار کیا
دیکھو ہم نے خود ہی سے یہ کیسا انوکھا پیار کیا

دل توڑ دیا اس نے یہ کہہ کے نگاہوں سے
پتھر سے جو ٹکرائے وہ جام نہیں ہوتا

تیرے قدموں کی آہٹ کو یہ دل ہے ڈھونڈتا ہر دم
ہر اک آواز پر اک تھرتھراہٹ ہوتی جاتی ہے

پوچھتے ہو تو سنو کیسے بسر ہوتی ہے
رات خیرات کی صدقے کی سحر ہوتی ہے

شمع ہوں پھول ہوں یا ریت پہ قدموں کا نشاں
آپ کو حق ہے مجھے جو بھی جی چاہے کہہ لیں

ہنس کے جواں دل کے ہم کیوں نہ چنیں ٹکڑے
ہر شخص کی قسمت میں انعام نہیں ہوتا

ان کہی ان سنی سی کچھ باتیں
سونے دن اور یہ سنساں راتیں

اب آنکھ کھلی اب ہوش آیا
بہکا سا جب گل پوش آیا

اپنا ہی سودا کر بیٹھے
تم سا جو صبا فروش آیا

نہ کوئی شہر نہ رستہ نہ سفر
منتشر ذہن کی الجھی گھاتیں

مینا کماری ناز۔۔۔

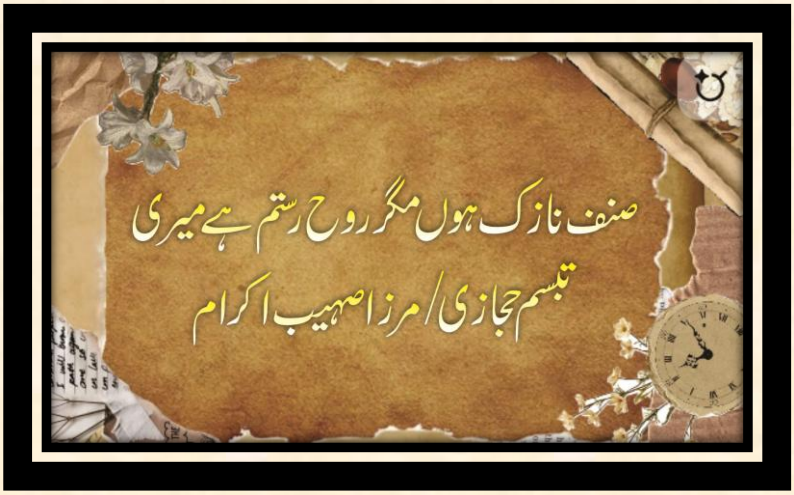

زمانہ قدیم سے آج تک عورت کے معاشرے میں مقام پر بحث مباحثے ہوتے رہے ہیں۔ اکثر مذاہبِ میں اگرچہ عورت کو اونچا مقام دیا گیا ہے لیکن حقیقی زندگی اور معاشرے میں عورت کو ہمیشہ کمتر اور محدود صلاحیت کا مالک مانا جاتا رہا ہے۔۔ امریکہ جیسے ملک میں پچھلی صدی کے وسط تک خواتین حق رائے دہی سے محروم تھیں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ان حالات میں بھی کچھ خواتین ایسی گزری ہیں جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ کارزارِ سیاست سے لے کر سائنس تک اور ادب سے لے کر خلا تک اپنی ذہانت اور جدوجہد سے کامیابی کے جھنڈے گاڑھے ہیں۔ ان ہی خواتین کو دنیا بھر کی خواتین میں خاص قدر و منزلت حاصل ہے۔

عورت کیا ہے۔۔۔ اس پر بے شمار آرا فلسفے اور کہانیاں ہیں۔۔۔ یہ خدا کی ایک تخلیق ہے، کائنات کا حسن ہے۔ زمانے کی تکمیل ہے یا زمین پر خدا کے وجود کا سب سے خوبصورت ثبوت یا بس مرد کی ایک ضرورت ہے۔۔

مختلف مذاہب اور عقائد کی رو سے عورت کا وجود مرد کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ ادب کی زبان میں کہا جائے تو عورت مرد کے وجود سے جدا ہونے والا لافانی حسن ہے جس کے بنا اور جس کے انکار سے دنیا کا ہر مرد ادھورا ہے۔ عورت نا صرف دنیا میں مرد کو لانے کا ذریعہ ہے بلکہ انسان کی پہلی تربیت گاہ بھی ہے۔۔ بچے کی نگہداشت سے لے کر اسے معاشرے کا فعال شخص بنانے تک ہر قدم پر عورت کا وجود ماں بہن بیوی کی شکل میں اس کا معاون ہوتا ہے کائنات کے پہلے انسان سے آج تک عورت کا وجود قائم ہے لیکن مذاہب کے بعد انسان جب عائلی اور معاشرتی پھندوں میں الجھا تو عورت کے لیے نت نئے قوانین، اصول اور ضابطے مرتب ہونے لگے۔ وقت کی چکی اس قدر سخت کر دی گئی کہ عورت کی سوچ کی اڑان کو خود اس کے ذہن سے محو کر دیا گیا ۔ عورت کے لیے عقل و شعور, تعلیم اور سوچنے کے تمام در اس طرح بند کیے گئے کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو افزائش نسل کا ایک ذریعہ اور گلدان میں سجا پھول سمجھنے لگی لیکن اُس دور میں بھی جب عورت کو مرد کی چتا پر زندہ جلا دیا جاتا تھا جب عورت کاری کر دی جاتی تھی جب عورت مرد کی ضرورت پوری کرنے کا نام تھا تب بھی خواتین کے ایک طبقے نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور معاشرے میں اپنی بقا کی کوشش جاری رکھی۔

جب بھی موقع ملا خود کو مرد کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ اہل ثابت کیا اور دنیا کو یہ پیغام دیا کہ عورت بھی خدا کی افضل تخلیق اور اشرف المخلوقات میں شامل ہے۔ اسے بھی زمانے میں وہ تمام حقوق حاصل ہیں جن پر مرد صدیوں سے اکیلا قابض ہے۔ عورت کے پہچان کی یہ لڑائی کسی مرد یا مخصوص قوم کے خلاف نہیں بلکہ صدیوں سے قائم اس استحصالی سوچ کی خلاف ہے جو پدر سری معاشرے میں سب سے بڑا ہتھیار ہے اور بہت ساری خواتین بھی اس گھٹن کو جائز و احسن سمجھتی ہیں۔۔

دورِ حاضر سے تاریک ترین ماضی تک تاریخ کو کنگالا جائے تو ایسے ہزاروں افراد مل جاتے ہیں جنہوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں انسانیت کی بقا کے لیے کام کیا۔ غار سے لے کر محلات تک انسان کی زندگی جدوجہد سے عبارت رہی ہے۔ ہر دور کے انسان نے اپنے ماضی سے سبق سیکھا اور نئی نسلوں کے لیے سہانے مستقبل کے کچھ خواب دیکھے۔ ازل سے ایک جدوجہد تو بطور مجموعی انسان کر رہا ہے لیکن ایک اور جدوجہد بھی ہے جو انسان کے اندر چل رہی ہے۔ غار کے انسان سے ٹیکنالوجی کی تیز ترین دنیا تک مرد اور عورت ایک دوسرے کے حوالے سے کچھ تحفظات کا شکار رہے ہیں۔

کسی ملک پر حکمرانی اور تخت و تاج سنبھالنے کے لئے عورت کبھی پہلا انتخاب نہیں رہی لیکن حالات اور وجوہات جو بھی ہوں تاریخ میں کئی ایسی خواتین حکمرانوں کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے موقع ملنے پر نا صرف حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی بلکہ ایک مثال قائم کی۔ قبل مسیح میں قدیم مصر کی ملکہ ہاتشپ سوت (Hatshepsut) سے لے کر جو پہلی فراعنہ ملکہ تھی، قلوپطرہ تک جو آخری فراعنہ ملکہ تھی۔۔ یہ خواتین بہادری، ذہانت میں کسی سے کم نہ تھیں۔ بازنطین سلطنت کی تھیوڈرا، روس کی کیتھرین دی گریٹ، فرانس کی جوائن آف آرک، انگلینڈ کی کوئین وکٹوریہ اور کوئین البز تھ، اسٹریا کی میریا تھریسا، ہندوستان کی رانی لکشمی بائی تاریخ کی چند یادگار حکمران اور جنگجو خواتین کہی جاتی ہیں۔

اسلامی تاریخ پر نظر ڈالیں تو گیارہویں صدی میں یمن کی ملکہ ارواہ ال سلیہی ہیں جنہوں نے نصف صدی تک حکومت کی۔ تیرہویں صدی میں قلوپطرہ کے بعد مصر کے تخت پر بیٹھنے والی پہلی مسلم خاتون سلطانہ شجر الدر، مراکش کی سیدہ ال ہرا اور انڈونیشیا کی سلطانہ تاج عالم جیسی مزید روشن مثالیں بھی ہیں جہاں مسلم خواتین نے سلطنت کے امور بھی سنبھالے اور جنگیں بھی لڑی۔۔ ایسی ہی ایک تاریخ ساز مسلم خاتون تھیں رضیہ سلطان۔

رضیہ سلطان

1240 - 1205

ہندوستان کی پہلی مسلم حکمران خاتون تھیں۔ تخت دہلی کی جنگ صدیوں تک جاری رہی۔ پہلے یہاں کے مقامی راجا مہاراجہ آپس میں جنگ و جدل میں مصروف رہے۔ اس کے بعد دنیا بھر سے خصوصاً عرب اور ترک النسل حاکم یہاں آئے اور مختلف ادوار میں مختلف سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ بڑے بڑے شہنشاہوں بادشاہوں نے تخت دہلی پر وقت گزارا ہے لیکن کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہندوستان کے تخت و تاج پر ایک دن ایک عورت کی حاکمیت ہو گی۔ تاریخ جسے رضیہ سلطان کے نام سے یاد کرتی ہے۔

تیرہویں صدی میں جب مسلمان خواتین کا بے پردہ غیروں کے سامنا آنے کا تصور بھی محال تھا اس وقت ایک مسلم خاتون کا دہلی کے تخت پر حکومت کرنا ایک انتہائی مشکل اور بہادری کا کام تھا۔

ہندوستان میں خاندان غلاماں یا مملوک سلطنت کی ابتدا قطب الدین ایبک نے 1210 میں کی اس کے داماد اور اگلے سلطان التمش کی ایک بیٹی رضیۃ الدنیاوالدین تھی۔ جس کی پیدائش 1205 میں ہوئی۔۔

سلطان التمش نے اپنے بچوں کی تربیت پر خصوصی دھیان دیا۔ رضیہ کو بھی اپنے بھائیوں کی طرح سپہ گری اور حکومت کے امور کی تعلیم دی گئی۔ رضیہ کے علاوہ التمش کے تینوں بیٹے حکومت سنبھالنے کے اہل نہیں بن سکے۔ رضیہ کی تربیت جس انداز سے ہوئی تھی اس نے اسے پُر اعتماد، بہادر اور معاملہ فہم خاتون بنادیا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ حکومتی امور کے معاملات میں مشورے دیا کرتی تھی اسی لئے 1231 میں گوالیار کے مشن پر جاتے ہوئے سلطان التمش نے رضیہ کو حکومت کا منتظم بنایا۔ سلطان التمش نے رضیہ کو اپنا وارث قرار دینے کے لئے اپنے امراء اور قاضی سے مشورے کئے لیکن انھیں مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔۔

سلطان التمش کے انتقال کے بعد رضیہ کے سوتیلے بھائیوں کی سازشوں سے قائم حکومت بہت جلد اختتام پر پہنچی رضیہ نے جامع مسجد میں لوگوں سے خطاب کیا اور ان سے انصاف طلب کیا۔ عوام نے رضیہ کا ساتھ دیا۔۔ 1236 میں رضیہ سلطان دہلی کے تخت پر بیٹھنے والی پہلی مسلم حکمران بنی۔۔

رضیہ سلطان نے اپنے دور میں جو سکہ رائج کئے ان پر اپنا نام سلطانہ کی جگہ سلطان رضیہ الدنیاوالدین لکھوایا۔ اس کے علاوہ" خواتین کا ستون "اور "ملکہ وقت " کے خطاب بھی رضیہ کے لئے کہے جاتے رہے ہیں۔ رضیہ سلطان نے حکومت سنبھالنے کے بعد عباسی خلیفہ امام مستنصر کی بیعت کر کے اپنی حکومت کو منوایا۔ رضیہ سلطان نے کئی اسکول، اکادمی اور لائبریریاں بنوائیں۔ ان اسکولوں میں قرآن و حدیث کے علاوہ فلسفہ، سائنس، فلکیات اور مختلف علوم پڑھائے جاتے تھے۔

رضیہ سلطان نے کئی لڑائیاں لڑیں۔ بغاوتوں کو کچلا کچھ علاقوں کو فتح کیا اور سلطنت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی اور اس کام کے لئے رضیہ کو پردے سے باہر آکر مردانہ لباس پہننا پڑا۔ رضیہ سلطان کی شادی الطونیہ سے ہوئی تھی لیکن جلد ہی دونوں مارے گئے ۔

رضیہ سلطان کے بارے میں لکھنے والوں میں سب سے اہم ابن بطوطہ نے خوب لکھا ہے رضیہ سلطان اپنے تکلیف دہ انجام کے باوجود لوگوں کے لئے ایک مشعل راہ تھی۔ ایک غلام کی بیٹی جو اتنے بڑی اور عظیم مملکت کی پہلی خاتون حکمران بنی۔ جس نے اپنی ذہانت بہادری اور ثابت قدمی سے لوگوں کو یہ دکھادیا کہ عورت رسموں رواجوں کے دائروں میں رہتے ہوئے بھی کیا کچھ کر سکتی ہے۔

رضیہ سلطان نے صرف پینتیس سال کی عمر پائی اور چار سال سے کچھ کم عرصہ حکومت کی لیکن اتنی مختصر زندگی میں تاریخ کے پنوں میں اپنا نام امر کر دیا۔

ملکہ نور جہاں

1577-1645

مہر النسا کی پیدائش معزز فارسی گھرانے میں ہوئی۔۔ دونوں والدین کا تعلق امرا اور اشرافیہ سے تھا لیکن وقت کے ساتھ ان کے حالات خراب ہوتے گئے اور مہر النسا کے والد اصفہان سے مغل انڈیا آ گئے 1594 میں سترہ سالہ مہر النسا کی شادی شیر افگن خان سے ہوئی۔۔

شیر افگن اکبر کی فوج میں عہدے دار تھا ان کی اکلوتی بیٹی مہر النسا تھی جو بعد میں لاڈلی بیگم کے نام سے مشہور ہوئی۔ شادی کے تیرہ سال بعد شیر افگن مارا گیا اور مہر النسا اپنی بیٹی کے ساتھ رقیہ سلطان بیگم کے پاس آ گئی ۔۔ یہاں چند سال گزارنے کے بعد محل کے مینا بازار میں جہانگیر سے ملاقات ہوئی اور 25 مئی 1611 کو ان کی شادی ہو گئی چونتیس سال کی عمر میں نور جہاں جہانگیر بیسوی اور آخری بیوی بنی اور جہانگیر نے اسے نور جہاں کا ٹائٹل دیا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی لیکن جہانگیر نے نور جہاں کو کافی اختیار دیئے۔ جہانگیر کے نشے کی لت نور جہاں کے اختیارات بڑھا دیئے اور ایک وقت یہ آیا کہ پوری مغلیہ سلطنت کا کنٹرول اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

اس نے اپنے والد کو وزارت عظمی کا عہدہ دلایا اس کے علاوہ بھی کئی رشتہ داروں کو اونچے عہدوں پر فائز کیا تا کہ اس کا اثر رسوخ پھیلتا جائے۔۔

نور جہاں شیر کے شکار کی شوقین تھی۔ اس نے اپنے دور میں سرحدوں کی حفاظت کی۔ بغاوت کو کچلا اور تخت کی جانشینی کے جھگڑے نمٹائے۔۔ مہبت خان سے جہانگیر کو چھڑانے کے کے لئے خود جنگ کی۔۔

جہانگیر کے مرنے کے بعد کئی سال تک شہزادہ خرم عرف شاہ جہاں سے کافی عرصہ رسہ کشی چلتی رہی اور اپنے آخری ایام نور جہاں نے لاہور میں گزارے۔

مدر ٹریسا

Aug 26 1910- Sep 5 1997

"میں دنیا کو نہیں بدل سکتی لیکن پانی میں پہلا پتھر پھینک کر ہلچل ضرور پیدا کر سکتی ہوں - "۔۔ مدر ٹریسا

دنیا میں انسانیت ہمدردی محبت ایثار قربانی کا کوئی بھی باب جس عظیم ہستی کے بنا پورا نہیں ہو سکتا وہ عظیم ہستی جس نے دنیا کو انسانیت کے نئے معنی عطا کیے جس نے محبت و ایثار کو مذہب اور رنگ و نسل سے بلند ہو کر ایسے نبھایا کہ وہ انسانیت کے لیے ماں بن گئی۔ اس اکیلی اور بے سر و ساماں خاتون نے بے سہارا لوگوں کے دکھ اس طرح بانٹے کہ شاید کئی ریاستیں مل کر بھی اتنا کام نہ کر سکیں جتنا اس ایک خاتون نے کیا۔ اگر دنیا میں ایثار قربانی ممتا اور محبت کی مجسم شکل دیکھنی ہو انسان مدر ٹریسا کو دیکھ سکتا ہے۔

پدم شری اور نوبل پرائز یافتہ مدر ٹریسا نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ انڈیا میں فلاحی کاموں کے لئے وقف کر دیا تھا جس میں جذام، ٹی بی اور ایڈز کے مریضوں کی دیکھ بھال اور یتیم خانے جیسے کئی پروجیکٹ شامل ہیں۔

ٹریسا کی پیدائش کیتھولک البانی فیملی میں اسکوپے نامی شہر میں ہوئی۔ ان کا پیدائشی نام اگنیز گوکشے تھا۔ بچپن سے ہی ٹریسا کو مشنری کے قصہ متاثر کرتے تھے اپنی ٹین ایج میں ٹریسا نے طئے کر لیا تھا کہ انھیں نن بن کر لوگوں کے کام آنا ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ انگلش سیکھنے اور مشنری جوائن کرنے آئر

لینڈ آئیں اس کے بعد انھوں نے اپنی فیملی کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ پھر وقت نے دیکھا کہ ساری دنیا اس کا گھر بن گئی اور تمام دکھی انسان ان کا خاندان کہلانے لگا۔

1929 میں وہ انڈیا پہنچی اور دارجلنگ میں اپنی ٹریننگ کی ابتدا کی۔ ٹریننگ مکمل کرنے کے بطور مشنری اپنا عہد اٹھا کر انہوں نے اپنا نام اگنیز سے تبدیل کر کے ٹریسا رکھا اور اسکول میں پڑھانا شروع کیا جہاں وہ بیس سال تک پڑھاتی رہیں۔ لیکن انڈیا میں غربت سے پسے لوگ، 1943 کے قحط بنگال اور فسادات نے انھیں ہلا کر رکھ دیا۔

1948 انھوں نے اسکول چھوڑ کر اپنی باقی زندگی فلاحی کاموں کے لئے وقف کر دی۔ انھوں نے انڈین شہریت لے لی اور مقامی لوگوں سے قریب ہونے کے لئے اپنا روایتی نن کا لباس چھوڑ کر سفید ساڑھی پہننی شروع کر دی۔۔ ابتدا میں بہت سی مشکلیں پیش آئیں۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کے باعث انھیں لوگوں سے مانگ کر کھانا اور دوائیاں جمع کرنا پڑتیں۔ آہستہ آہستہ لوگوں کی مدد شامل حال ہونے لگی اور 1950 میں مشنری آف چیریٹی " نامی ادارہ قائم ہوا۔ جو ایسے بھوکے ننگے، اپاہج، کوڑھی، بیمار ہر طرح کے مجبور و بے سہارا لوگوں کی دیکھ بھال کے لئے تھا جن کی سماج میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

1952 میں مدر ٹریسا نے ایک اور ادارہ" نرمل ہردیئے "کے نام سے بنایا جو قریب المرگ اور نادار لوگوں کو میڈیکل سہولیات اور ایک باعزت پر سکون موت مہیا کرتا۔۔ اس کے علاوہ کوڑھ کے مریضوں کے لئے شانتی نگر، بے گھر بچوں کے لئیے ششو بھون جیسے اداروں کی بنیاد رکھی۔۔۔ وقت کے ساتھ اور لوگوں کی مدد اور عطیات سے ایسے ادارے سارے انڈیا میں قائم کئے جانے لگے اور اس کے بعد وینیزویلا، اٹلی آسٹریا اور ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک تک جا پہنچے۔

کلکتہ میں تیرہ ممبرز سے شروع ہونے والا یہ گروپ 1997 تک چار ہزار ممبرز تک پہنچ گیا تھا جن کے تحت مختلف ممالک میں غریب، بے گھر، معذور، نشہ باز، رفیوجی، کوڑھ اور قحط سے متاثر غرض کہ ہر قسم کے مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کی جاتی ہے۔ اور یہ ادارہ انھیں چھت مہیا کرتا ہے۔ کل سو ممالک میں پانچ سو سے زائد ایسے ادارے قائم ہو چکے ہیں۔۔

مدر ٹریسا کو نوبل پرائز اور پدم شری کے علاوہ دنیا کے بہت سے ممالک میں اعزازات سے نوازا گیا کئی اعزازی ڈگریاں بھی دی گئی لیکن ان کا سب سے بڑا انعام اور اعزاز لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت اور محبت ہے جو کسی ریاکاری یا دولت سے خریدا ہوا نہیں بلکہ وہ انسان دوستی کا ثمر ہے۔ گیلپ کے پول میں وہ اٹھارہ بار دنیا کے ٹاپ ٹین پسندیدہ لوگوں کی لسٹ میں آئی تھی۔۔

اندرا گاندھی

19 Nov 1917-31 Oct 1984

کہا جاتا ہے کہ سیاست اور جمہوریت میں وراثت نہیں ہوتی بلکہ انسان کو اپنی قابلیت کی بنیاد پر آگے آنا چاہیے لیکن یہ نظریہ اس اعتبار سے ضرور غلط ہے کہ سیاست میں وراثت کرسی کی بھلے نہ ہو لیکن اقدار اصولوں اور اخلاقیات کی وراثت ضرور ہوتی ہے۔

نہرو کی وراثت جب اندرا گاندھی نے سنبھالی تو وہ صرف ایک کرسی نہیں تھی بلکہ وہ انسانی حقوق سیکولرازم اور رنگ و نسل سے بلند ہو کر انسان کی خدمت کرنا تھی۔ اندرا گاندھی نے نہرو کی وراثت کو سینے سے لگایا اور اس میں پہلے سے بھی زیادہ جان پھونک دی اور یہ بتایا کہ صرف اقتدار حاصل کرنا اہم نہیں ہوتا بلکہ اس کا حق ادا کرنا معنی رکھتا ہے۔ دنیا میں بہت سی خواتین نے اقتدار حاصل کیا لیکن اندرا نے کانگرس کی آئیڈیالوجی کو بھی ساتھ سنبھالا اور اسے اگلی نسل تک منتقل کیا۔

اندرا گاندھی انڈیا کی پہلی اور اکلوتی خاتون سربراہ مملکت ہیں۔ اندرا پریادرشنی کی پیدائش برٹش انڈیا میں الہ آباد کے نہرو خاندان میں ہوئی۔ ان کے والد جواہر لال نہرو انڈین نیشنل کانگریس اور آزادی کی مہم کا اہم حصہ رہے اور آزاد ہندوستان کے پہلے پرائم منسٹر بنے تھے۔ اندرا اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اندرا کا بچپن تنہائی میں گذرا۔ ان کی والدہ بیمار رہا کرتی تھیں اور والد سیاسی سرگرمیوں میں مصروف یا پھر قید میں ہوتے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر اور دہلی اسکول میں حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصہ رابندر ناتھ ٹیگور کے شانتی نکیتن میں گذارا جہاں ٹیگور نے انھیں پریادرشنی کا ٹائٹل دیا۔ آگے کی تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی میں حاصل کی۔ یہیں پہلے اندرا کی ملاقات اور پھر شادی فیروز گاندھی سے ہوئی۔

جواہر لال نہرو کے بطور پرائم منسٹر پہلے دور میں اندرا گاندھی نہ صرف ان کی مددگار بنی رہی بلکہ کسی حد تک کانگریس کی باگ دوڑ بھی سنبھال لی اور 1959 میں وہ کانگریس کی صدر بن گئیں تھیں۔۔ لال بہادر شاستری کی موت کے بعد لوگوں نے اندرا گاندھی کو اپنا لیڈر یہ سوچ کر چنا کہ وہ ایک خاتون ہیں اور انھیں بآسانی کنٹرول کیا جاسکے گا لیکن 1966 سے 1977 تک اگلے گیارہ سال جو اندرا گاندھی نے بطور پرائم منسٹر گذارے اس نے ثابت کر دیا کہ اندرا گاندھی کتنے مضبوط ارادوں اور سیاسی سوجھ بوجھ والی خاتون تھی۔ ۔۔ پیسوں کی devalue کرنے کی پالیسی اور سوشلسٹ آئیڈیالوجی کی طرف رجحان، بینکوں کو نیشنلائز کرنے جیسے اقدامات نے اندرا گاندھی کو کئی مسائل میں بھی پھنسایا لیکن اس کے باوجود اندرا گاندھی اپنے اقتدار کو قائم رکھنے میں کامیاب رہی۔۔ اپنے اقتدار کے دوسرے دور میں اندرا گاندھی نے ایک طرف عوام کو غریبی ہٹاؤ نعرہ دے کر اپنی پوزیشن کو مضبوط بنایا تو دوسری طرف 1971 کی انڈیا پاکستان جنگ میں حاصل کی گئی فتح نے پورے ملک میں اندرا گاندھی کو مقبول ترین شخصیت بنا دیا۔۔

لیکن یہ مقبولیت جلد ہی خطرہ میں پڑ گئی جب کورٹ نے الیکشن بدعنوانی کے الزام میں اندرا گاندھی کو لوک سبھا کی سیٹ سے خارج کر دیا۔ اس کے بعد کا دور اندرا گاندھی کے دور حکومت کا بدترین دور کہلاتا ہے۔۔۔ جب ملک بھر میں ایمرجنسی لگ گئی تھی اور سیاسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے تھے جس کا انجام 1977 میں اندرا گاندھی کی شکست کے صورت میں ظاہر ہوا۔ جس کے بعد اقتدار جنتا پارٹی اور اس کے حلیفوں کے ہاتھ میں آگیا لیکن وہ حکومت تین سال سے زیادہ نہیں رہ سکی۔۔ 1980 میں شاہی امام کے ساتھ ایک معاہدہ کرنے کے بعد اندرا گاندھی دوبارہ اقتدار میں آگئی۔۔ لیکن جون 1984 میں کیا آپریشن بلیو اسٹار اندرا گاندھی کے قتل کا باعث بن گیا۔ وہ 31 اکتوبر 1984 کو اپنے ایک باڈی گارڈ کی گولیوں کا نشانہ بن گئیں۔۔ حکومت میں کامیابی

ناکامی سیاسی جماعتوں کے ساتھ ہوتی رہتی ہے اور لیڈرز سے بعض غلط فیصلے بھی ہوتے ہیں لیکن اندرا گاندھی بطور وزیر اعظم اتنی بلند تھیں کہ انھوں نے اقدار کی جو وراثت حاصل کی اسے پورے فخر کے ساتھ آگے منتقل کیا۔ سیاسی مخالفین نے نفرت کی آگ بھڑکا کر ان کو قتل تو کروادیا لیکن ان کے قد کاٹھ اور بلندی کو کبھی کم نہیں کیا جاسکا۔

اندرا گاندھی جنوبی ایشیا کی ایک پاور فل لیڈر تھیں۔ سویت یونین اور امریکہ کے ساوتھ ایشیا میں اثر کم کرنے کے لیئے سارک کی بنیاد رکھنے میں اندرا گاندھی کا بڑا ہاتھ تھا۔۔

اندرا گاندھی کی ایک اور بڑی کامیابی انڈیا کی نیوکلیئر کلب میں اینٹری تھی۔۔ اندرا گاندھی نے اپنے والد کے شروع کئے کام کو تکمیل تک پہنچایا اور 1974 میں پوکھران میں نیوکلیئر ٹیسٹ ہوا۔

اندرا گاندھی نے ہمیشہ کوشش کی اور اپنی سیاسی کیریئر میں اپنی صنف کا کبھی استعمال نہیں کیا اور نہ ہی انھوں نے اپنی پارٹی میں عورتوں کے لئے کوئی خصوصی پوزیشن رکھی لیکن اس کے باوجود خواتین کی ایک بڑی تعداد انھیں ویمن پاور کی علامت مانتی ہیں۔ اندرا گاندھی کا نام نا صرف انڈیا بلکہ برصغیر میں خواتین کی جدوجہد کے حوالے سے روشن مثال ہے جس نے دنیا کی سب کی بڑی جمہوریت کا بوجھ اپنے کندھوں پر احسن طریقے سے اٹھایا اور اس کی لاج رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

بے نظیر بھٹو

بے نظیر بھٹو کی پیدائش 21 جون کو کراچی میں ایک سندھی کردش گھرانے میں ہوئی۔ والد ذوالفقار بھٹو کا تعلق زمیندار اور سیاستدانوں کی فیملی سے تھا۔ بے نظیر کے تین بھائی بہن اور تھے۔ ابتدائی تعلیم کراچی اور مری میں ہوئی۔۔ والد کے سیاسی تعلقات کی وجہ سے کم عمری سے ہی سے بے نظیر کا سیاست دانوں سے اور سفارت کاروں سے ملنا ملانا رہا۔ بے نظیر نے سولہ سال کی عمر میں ہاورڈ جوائن کیا اور 1973 میں اپنا بیچلرز مکمل کیا۔ اپنی تعلیم کے دوران بھی وہ کئی سوشل ایکٹویٹز سے جڑی رہیں اور اپنے والد کے ساتھ کئی بڑی میٹنگز جیسے شملہ سمجھوتا ،او آئی سی سمٹ وغیرہ۔ لیکن ان کی تعلیم یہاں ختم نہیں ہوئی ہاورڈ کے بعد آکسفورڈ جیسے ادارہ سے پولیٹکس اور اکنامکس میں ڈگری لی اور انٹرنیشنل لا بھی پڑھا۔ اکسفورڈ میں ایک بھرپور تعلیمی دور گزارنے کے بعد 1977 میں پاکستان لوٹ آئی۔۔

واپسی بے نظیر کے لئے خوش گوار نہی رہی ملک میں فوجی کنٹرول آنے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی اور بے نظیر اور ان کی والدہ کچھ عرصہ قید اور پھر نظر بند رہیں۔ لیکن اس کی باوجود ملک میں جمہوریت بحالی کے لئے کوشش جاری رہی۔۔ مختلف مخالف پارٹیوں کے ساتھ مل کر اس کوشش کو آگے بڑھایا لیکن 1981 میں پھر گرفتار ہوئیں اور تین سال تک قید کی سختیاں برداشت کی جس کا اثر ان کی صحت پر ہوا۔ آخر کار بین الاقوامی پریشر کے باعث بے نظیر کو جلاوطن کر کے جینوا بھیج دیا گیا وہاں سے وہ لندن چلی گئی۔۔ اگلے کچھ سال قید کے ٹراما سے نکل کر سماجی اور سیاسی رابطے

بحال کرنے میں گزارے۔ اس بیچ بے نظیر کی بڑھتی مقبولیت کے باعث ان کا اپنے ہی بھائیوں سے اختلاف ہوتا رہا۔ 1986 میں مارشل لا کے خاتمہ کے بعد پاکستان لوٹی

عوام نے بے نظیر کا پر جوش استقبال کیا لاکھوں لوگ انھیں سننے آئے۔ بے نظیر کی شہرت صرف سندھ تک نہ رہ کر پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ 1987 میں بے نظیر کی شادی آصف علی زرداری سے ہوئی شادی اور پہلے بچے کی پیدائش کے بعد بھی بے نظیر نے اپنی والد کی وراثت کو آگے بڑھانے کا کام جاری رکھا اور آنے والے الیکشن کی تیاری میں لگی رہیں۔ بے نظیر نے عوامی سطح پر کافی مقبولیت حاصل کرلی تھی لیکن اس کے باوجود کچھ پارٹیوں نے عورت کی قیادت کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے بے نظیر کی خلاف محاذ بنالیا جس کے باعث وہ واضح اکثریت نہیں حاصل کر سکی اس کے باوجود متحدہ قومی موومنٹ کے ساتھ مل کر بے نظیر نے حکومت بنائی اور 2 دسمبر 1988 کو کسی بھی مسلم ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم بننے کا اعزاز حاصل کیا ساتھ ہی وہ 35 سال میں اس عہدے پر پہنچنے والی دنیا کی پہلی کم عمر پرائم منسٹر بھی تھیں۔

لیکن دو سال کی یہ وزارت عظمی بے نظیر کے لیے کافی چیلنجنگ رہی۔ ایک طرف قرضہ میں ڈوبی معیشت، بیروزگاری، افغان جنگ انڈیا پاکستان کے حالات، کشمیر اور سندھ میں ہوئے لسانی فسادات جیسے مسائل نے دو سال میں یہ حکومت ختم کر دی۔ اگلے تین سال اپوزیشن میں گزارنے کے بعد بے نظیر 1993 میں دوبارہ وزیر اعظم بنی۔۔

لیکن یہ دور ان کے شوہر کے کرپشن اور مہاجروں کے خلاف اٹھائے اقدامات کے باعث متنازعہ رہا۔۔ اور یہ حکومت مشکل سے تین سال چلی اسکے بعد کے چھ سال بھٹو نے ملک سے باہر جلاوطنی میں گزارے۔۔۔ نواز شریف اور پھر مشرف کے دور میں ملک سے باہر رہیں ان کی واپسی 2007 میں ہوئی۔

اسی سال ان کے قافلے پر خودکش حملہ ہوا لیکن بے نظیر بچ گئیں لیکن چند مہینہ بعد ہونے والے اگلے حملہ میں وہ آخر کار شہید ہو گئی

بے نظیر کا دور حکومت بہت صاف ستھرا نہیں رہا لیکن ان کا کمٹمنٹ جمہوریت اور مارڈن ایشیز پر رہا جسے وہ اسلامی مملکتوں کا مستقل سمجھتی تھی۔۔ اور برصغیر کی اور کسی بھی اسلامی جمہوریہ کی پہلی خاتون سربراہ ہونے کا اعزاز ہونے کے پاس ہے اور یہی ایک بڑی چیز ان کا نام برصغیر کی اہم نسوانی شخصیت میں لکھوانے کے لئے کافی ہے

لتا منگیشکر

28 ستمبر 1929 - 6 فروری 2021

موسیقی کو پوری دنیا میں خاص مقام حاصل ہے لیکن اگر بات ہندوستان کی موسیقی کی ہو تو یہاں ہر پیمانے بدل جاتے ہیں۔ یہاں کی مٹی میں سر تال اور لے بسا ہوا ہے۔ کلاسیکل موسیقی سے پلے بیک تک یہاں پر ہر دور میں ایک سے بڑھ کر فنکار پیدا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ فن یہاں سیکھنے سے زیادہ اترتا ہے۔ خوشی کا کوئی موقعہ ہو یا تیج تہوار ہوں یہاں سنگیت کے بنا ادھورے سمجھے جاتے ہیں۔

کچھ لوگوں کو ان کا فن اونچے مقام پر پہنچاتا ہے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے فن کی پہچان بنتی ہے۔ سنگیت کی پہچان بننے والی" نائٹ اینگل آف انڈیا "اور "میلوڈی کوئن "کہلانے والی ہستی لتا منگیشکر تھیں۔ مدھوبالا سے کاجول تک اور مینا کماری سے کرینا کپور تک ہندی فلموں کی ہر بڑی ہیروئن کی آواز بن کر خوبصورت گیتوں سے لوگوں کو مسحور کرنے والی بھارت رتن لتا منگیشکر کے جانے کے بعد انڈین میوزک کا ایک عہد اختتام پذیر ہوا۔

28 ستمبر 1929 کو برٹش انڈیا کی ریاست اندور کے ایک مراٹھا برہمن دیناناتھ منگیشکر اور شیوناتی کے گھر ایک بچی نے جنم لیا جس کا نام ہیمار کھا گیا ۔ دیناناتھ منگیشکر گوالیار گھرانے کے کلاسیکل سنگر اور تھیٹر ایکٹر تھے۔ بعد میں اس بچی کا نام لتا کر دیا گیا اور یہ نام ہندوستان کی موسیقی کی تاریخ میں امر ہو گیا۔ لتا پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے لی اور پانچ سال کی عمر سے باپ کے ساتھ تھیٹر میں کام شروع کر دیا لیکن بد قسمتی سے تیرہ سال کی عمر میں دیناناتھ منگیشکر کا انتقال ہو گیا اور کم عمر لتا پر اپنے خاندان کی کفالت کی ذمہ داری آ گئی۔ لتا نے یہ ذمہ داری احسن طریقے سے نبھائی اور بہن بھائیوں کو سنبھالا۔ ان کی بہنیں آشا، اوشا اور مینا بھی سنگر ز ہیں۔ ان کے بھائی ہر دے ناتھ منگیشکر ایک عمدہ موسیقار ہیں۔

والد کی موت کے بعد ماسٹر ونائک نے لتا کی فیملی کو سہارا دیا اور لتا منگیشکر کو کچھ مراٹھی فلموں میں گانے اور ایکٹنگ کا موقع دیا۔

1946 میں لتا ممبئی آ گئیں۔ جہاں انھوں نے استاد امان علی خان سے کلاسیکل میوزک سیکھنا شروع کیا اور 1946 میں پہلا ہندی گانا" آپ کی سیوا میں " فلم میں دتا دیجکر کی ڈائریکشن میں گایا۔۔

دو سال بعد ماسٹر ونایک کی موت کے بعد میوزک ڈائریکٹر غلام حیدر نے لتا کو اپنی سرپرستی میں لیا۔ اس دور میں فلمی سنگیت پر میڈم نور جہاں کا بہت اثر تھا۔ ایسے میں لتا منگیشکر کی باریک آواز کو اکثر لوگوں نے ریجیکٹ کر دیا لیکن ماسٹر غلام حیدر کو لتا کی صلاحیتوں پر یقین تھا اور انھوں نے لتا کو کئی مواقع دیئے۔ کئی موسیقاروں سے ملوایا۔ 1949 کی فلم محل میں لتا کا گایا" آئے گا آنے والا "گانا زبردست ہٹ ہوا اور جیسا کہا جاتا ہے کہ Rest is history

وقت نے ثابت کیا کہ یہ باریک آواز انڈسٹری کی سب سے زیادہ طاقتور آواز بنی۔ نرگس، وحیدہ رحمان سے مادھوری ڈکشٹ اور پریٹی زینٹا تک لتا ہر دور کی ٹاپ ہیروئنوں کی آواز بنی رہی۔

پچاس اور ساٹھ کی دہائی ہندی سنیما کا اور میوزک کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں لتا نے چوٹی کے میوزک ڈائریکٹر نوشاد، ایس ڈی برمن، سلیل چودھری، انیل بسواس، شنکر جے کشن، سری رام چندر، خیام، سجاد سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے میوزک ڈائریکٹر تک ہر کسی کے ساتھ کام کیا اور اپنی نمبر ایک پوزیشن مستحکم کر لی۔ ابتدا میں لتا کو اپنے اردو ہندی تلفظ پر کچھ تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد لتا نے ایک اردو ٹیچر سے باقاعدہ اردو سیکھی۔

لتا نے 1949 سے 2004 تک انڈیا کی چھتیس زبانوں میں کئی ہزار گیت گائے۔ ہندی کے علاوہ مراٹھی، گجراتی اور بنگالی میں لتا کے گائے گانوں کی تعداد کافی ہے۔ ان کے گائے کل گانوں کی صحیح تعداد پر اختلاف رائے ہے لیکن ہندی فلم گیت کوش کے مطابق لتا نے پانچ سے چھ ہزار کے قریب گانے

گائے۔ انڈین زبانوں کے علاوہ انگریزی، روسی، ڈچ اور سواحلی میں بھی گایا۔ گانوں کے علاوہ لتا نے پانچ فلموں میں میوزک بھی دیا اور تین ہندی اور ایک مراٹھی فلم پروڈیوس کی۔ جن میں سے " لیکن " نے پانچ نیشنل ایوارڈ جیتے اور اس فلم میں گائے لتا کے ساتوں گانے بہت اعلی سمجھے جاتے ہیں لتا کے اعزازات کی ایک طویل لسٹ ہے۔

انھیں 2001 میں انڈیا کا سب بڑا سول اعزاز بھارت رتن سے نوازا گیا اس سے پہلے پدم بھوشن اور پدم وبھوشن بھی حاصل کر چکی تھیں۔

1989 میں فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا ایوارڈ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ ملا۔

2009 میں فرانس کا سب بڑا ایوارڈ

Officer of the French Legion of Honour

حاصل کیا۔ 3 نیشنل ایوارڈ چار فلم فیئر اور 15 بنگال فلم جرنلسٹ ایسوسی ایشن ایوارڈ کے علاوہ کئی لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈز بھی ان کی لسٹ میں شامل ہیں ۔ 2012 میں لتا آؤٹ لک کے Greatest Indian پول میں دسویں نمبر پر تھیں۔

لتا کے بارے میں بڑے غلام علی کا یہ جملہ بھی اعزاز سمجھا جاتا ہے کہ " کمبخت کبھی بے سری نہیں ہوتی " ۔ دلیپ کمار جنھیں لتا بھائی مانتی تھی لتا کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ " لتا کی آواز قدرت کی تخلیق کا کرشمہ ہے " ۔

لتا نے ابتدائی دور میں محمد رفیع، کشور کمار، منادت اور ہیمنت کمار کے ساتھ اپنے زیادہ تر گیت گائے۔ اسی کی دہائی تک یہ سبھی سنگرز کے دنیا چھوڑ جانے کے بعد ادت نارائن، ابھیجیت، یسو داس اور سونو نگم جیسے نوجوان سنگرز کے ساتھ بھی اپنی آواز کا جادو جگایا۔ اس میں ان کی کلاسیکل سنگنگ کی مہارت کے علاوہ باقاعدہ ریاض کا کمال تھا کہ وہ پچھتر سال کی عمر میں بھی بیس سالہ ہیروئن کی آواز بن جاتی تھیں۔

1949 میں پہلی فلم سے 2004 میں ویر زارا تک لتا کے گائے گیتوں کی ایک طویل لسٹ ہے کلاسیکل، رومانوی، بھجن، کیبرے، غزل، فوک ہر قسم کا گیت اس میں شامل ہے۔ فوجیوں کے لئے گایا" اے میرے وطن کے لوگو " صرف پنڈت نہرو کو ہی نہیں رلا تا ہر سننے والوں کی آنکھ نم کر دیتا ہے۔

لتا منگیشکر نے اپنی زندگی کا سفر بنا کسی جیون ساتھی کے گذارا۔

6 فروری کو ان کی موت پر سرکار کی طرف سے دو روزہ سوگ کا اعلان ہوا۔

لتا منگیشکر انڈین موسیقی میں نسوانیت کی مضبوط آواز تھیں۔ ان کے بعد دوسری لتا کا تصور بھی محال ہے۔ ماہ و سال کی ریاضت مسلسل محنت اور کام سے محبت کی وجہ سے لتا لتا کے مقام تک پہنچی تھی۔ چالیس کی دہائی سے نئی صدی تک ایک ہی لگن سے کام کرتے رہنا اور ہر نسل کے نمائندہ گیت کاروں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا لیکن لتا نے اپنے فن کو پوری ایمانداری سے برتا اسی وجہ سے ہندوستانی سینما میں لتا ایک مثال ہے۔

لتا کے سنگیت کا سفر دراصل ہندی فلم کا آزادی کے بعد کے ستر سالوں کا سفر ہے۔ مختلف معاشرتی تبدیلیوں نے کس طرح گیت اور سنگیت کو بدلا اظہار کے طریقے بدلے۔ ہیروئنوں کے انداز بدلے لیکن ان سب میں لتا کی آواز وہی رہی جس نے لاکھوں کروڑوں انسان کو برسوں مسحور کئے رکھا اور رکھے گی۔

ارون دھتی رائے

November 24 1961

A عورت کو ادب میں ہمیشہ سے خاص مقام حاصل رہا ہے۔ صنف نازک کو ناول ڈرامے فلموں کہانیوں داستانوں میں خاص انداز میں بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ ادب کی بدقسمتی رہی ہے کہ ہر صنف میں جس ہستی پر صفحات کالے کیے گئے خود اس قبیلے کی کسی فرد کا نام کبھی بطور مصنف بڑا نہیں سمجھا گیا بلکہ یہ کہا گیا کہ ادب میں خواتین کی سوچ کی پرواز مردوں کے برابر نہیں اور خواتین ایک محدود سوچ کے تابع ہو کر لکھتی ہیں اس لیے کبھی بلند ادب تخلیق نہیں کر سکیں۔

لیکن اروندھتی رائے نے اس مفروضے کو غلط ثابت کیا اور اپنے قلم سے اس کا جواب دیا اور ایسے شاہکار رقم کیے جن کو نظر انداز کرنا دنیا کے کسی تنقید نگار کے بس کی بات نہیں۔

سوزان اروندھتی رائے۔۔۔ booker پرائز یافتہ اروندھتی ایک بیسٹ سیلر رائٹر ہونے کے علاوہ سیاسی ایکٹیویسٹ اور انسانی حقوق اور ماحولیاتی مسئلوں پر آواز اٹھانے والی ایک بیدار مغز خاتون ہیں۔

اروندھتی کی پیدائش میگھالیہ کے شہر شیلانگ میں ہوئی جہاں ان کے والد راجیو رائے ٹی پلانٹ کے مینجر تھے۔۔ماں باپ میں علیحدگی کے بعد اروندھتی اپنی ماں میری رائے کے ساتھ کیرالا چلی گئی اور وہیں اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی اس کے بعد دہلی کے کالج سے آرکٹیکچر میں ڈگری لی۔۔

1984 میں اروندھتی رائے کو پردیپ کرشن نے فلم میں رول دیا اس کے کچھ عرصے بعد ان کی اروندھتی رائے سے شادی بھی ہو گئی

1988 میں اروندھتی نے کچھ اسکرین پلے لکھے جس میں نیشنل ایوارڈ جیتنے والی فلم

In which Annie give it those one

اور Electric Moon بھی شامل ہیں۔۔اس فلم میں ایکٹنگ کے لئے اروندھتی کے ساتھ دہلی کے دو نئے آرٹسٹ شاہ رخ خان اور منوج واجپائی کو موقع ملا تھا۔۔ لیکن کچھ عرصہ بعد فلمی دنیا سے بددل ہو کر اروندھتی نے لکھنے پر توجہ دی اور اپنا پہلا ناول لکھنا شروع کیا.1996 میں شائع ہونے والا یہ اروندتی کی زندگی میں اہم سنگ میل ثابت ہوا۔۔اسے Booker Prize ملا اور یہ ناول ٹائمز کے بیسٹ سیلر میں شامل رہا۔شائع ہونے کے

ایک مہینے کے اندر یہ کتاب اٹھارہ ملکوں میں بکی۔ لیکن انڈیا میں اسے کافی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔۔اس کے بعد اروندھتی نے سیاسی اور معاشی مسائل پر بہت سے مضامین لکھے جن کے پانچ مجموعے۔

"My Seditious Hearts"

کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ان کا 2016 میں لکھا دوسرا ناول

The Ministry of Utmost Happiness

بھی کئی اہم ایوارڈز کے لئے نامزد ہوا۔

اروندھتی رائے نے کئی سیاسی مسئلوں پر آواز اٹھائی۔۔انڈیا کی نیوکلیئر پالیسی، کشمیر کی آزادی، پولیس کا ظالمانہ رویہ جیسے مسائل پر اٹھائی گئی ان کی آواز نے انھیں کافی مسائل میں مبتلا کیا اس کے علاہ نرمدا ڈیم پراجیکٹ میں لاکھوں لوگوں کے بے گھر ہونے کے امکان کو لے کر بھی اروندھتی نے بڑا جذباتی ہو کر لکھا ان کی لکھی پیٹیشن کے باعث انھیں ایک دن کے لئے تہاڑ جیل میں گزارنا پڑا۔۔حکومت کا نکسل وادیوں سے نمٹنے کا طریقہ کار ہو یا کیرالا حکومت کا متھنگا وائلڈ لائف پراجیکٹ پر لیا ایکشن۔۔۔اروندھتی نے حکومت کے خلاف حق بات کہنے میں کوئی خوف نہیں محسوس کیا۔2011 میں جب انا ہزارے کا آندولن اپنے عروج پر تھا اروندھتی نے اس کے پیچھے چھپے اصل مقاصد پر لکھا۔

اروندھتی کا قلم صرف ملکی مسائل تک ہی محدود نہیں ہے انھوں نے سری لنکا میں تاملوں پر ہونے والے ظلم پر بھی لکھا۔

امریکہ کی افغان پالیسی پر The Guardian میں لکھا ان کا مشہور آرٹیکل

The Algebra of Infinite Justice

کئی سوچنے پر مجبور کرنے والے سوال اٹھاتا ہے۔

اس کے علاوہ اروندھتی ان سو آرٹسٹوں کی لسٹ میں شامل ہیں جنھوں نے اسرائیل کے خلاف کھلا خط لکھا۔

اروندھتی رائے نے اس ماحول میں ہمیشہ حق بات کہی جہاں کوئی دوسرا بولنے سے پہلے سو بار سوچتا ہے وہ ہمیشہ حکومتوں کے لیے ناپسندیدہ رہی ہے کیونکہ وہ اپنے قلم کی طاقت کے ذریعے ریاست کو اس کا بدنما چہرہ دکھاتی ہے۔

اپنے لٹریری کاموں پر ملے ایوارڈز کے علاوہ بھی اروندھتی کو کئی اور ایوارڈ ملے۔لیننان فاؤنڈیشن ایوارڈ جو دنیا کے مظلوم لوگوں کے لئے آواز اٹھانے کے لئے دیا گیا اس کے لئے سڈنی پیس پرائز اور گلوبل ایکسچینج اسپیشل پرائز جیسے ایوارڈ بھی ملے۔2014 میں اروندھتی کا نام ٹائمز کی ٹاپ سو Most Influential لوگوں میں آیا

آج ادب، سماج کے اندر پھیلی برائیو ں، آمرانہ ریاستی پالیسیوں اور اقدامات کے خلاف اروندھتی رائے کا قلم عظمت کی علامت ہے۔ انہوں نے نا صرف خواتین میں اپنا مقام بنایا بلکہ اپنے قلم اور افکار کی بنیاد پر وہ دنیا کے مردوں کے لیے بھی مشعل راہ بن گئیں۔ آج دنیا بھر میں اروندھتی رائے کا نام عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور اس تاثر کی نفی ہوتی ہے کہ آج خواتین کسی بھی شعبہ میں کم تر یا کمزور ہیں۔

سیاست، سیادت، سماجیات، سوشل ایکٹیوسٹ آئی ٹی، سائنس، آرٹ, ادب، میڈیکل الغرض جہاں جہاں خواتین نے کچھ کر دکھانے کی ہمت کی اس شعبے میں اپنا نام اس قدر بلند کیا کہ آج وہ تمام شعبے ان خواتین کے ذکر کے بنا ادھورے ہیں۔ لیکن یہ صرف چند نام ہیں ورنہ ایک طویل فہرست ہے ایسی خواتین کی جو اپنے عہد کی پہچان بنیں چاہے وہ مغربی معاشرے کی ہیلن کیلر، این فرینک، اوپرا ونفری ہو یا برصغیر کی تاریخ سے رضیہ سلطان، رانی لکشمی بائی، بے نظیر، سریماو بندرانایک اور سرسوتی پھلے ہوں یا آج کی جیسنڈا اردن، کملا ہیرس، خالدہ ضیا، ممتا بنرجی، سونیا گاندھی جیسی طاقتور خواتین جو ان بڑے ممالک کی سیاست میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

آج کی دنیا میں عورت جنگجو ہے، فوجی ہے، استاد ہے، سائنس دان ہے، کرکٹر ہے، بینکر ہے، جاسوس ہے، فٹبالر ہے، باکسر ہے, سیاح ہے, خلانورد ہے، صحرا گرد ہے، مصنف و ادیب ہے، شاعرہ ہے۔ آج عورت صرف شو پیس نہیں بلکہ آج وہ دنیا کی آبادی کا نصف سے کچھ زیادہ ہے اور اب وہ دنیا کے ہر شعبے میں پہلی ضرورت ہے۔ آج کی خواتین نے ان تمام مفروضوں کو غلط ثابت کر دیا ہے جو صدیوں سے چلے آرہے تھے کہ عورت کا کام صرف گھر چلانا ہے بچے پالنا ہے اور اس میں دوسری صلاحیتوں کی کمی ہے یا وہ جسمانی اعتبار سے محتاج ہے یا وہ چار دیواری کے پیچھے رہے تو ہی محفوظ ہے یا اس سے جڑی بعض انسانی ضروریات کسی کمزوری کا نام ہیں ۔

لیکن دنیا کے سفر کے ساتھ عورت کا سفر آج بھی جاری ہے ان ساری کامیابیوں کے باوجود وہ آج بھی دنیا کے کئی خطوں میں اپنی شناخت حیثیت اور وجود کے لیے نبرد آزما ہے اور وہ دنیا کو بارہا بتا چکی ہے کہ وہ کمزور نہیں وہ نالائق اور کم عقل نہیں۔ وہ بھی انسان ہے اور وہ موقع کی تلاش میں ہے کہ اس کو کب انسان سمجھ کر برتاؤ کیا جائے گا اور وہ اپنی وہ جگہ حاصل کرئے گی جو اس کا حق ہے ۔